نگار

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

مادر وطن کی فلاح و بہبود کیلیے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس پائدار اور ہموار

اُونی ویونگ یارن

اور

ہینڈ نٹنگ وول

جدید ترین طریقے سے تیار کیے جاتے ہیں

گرینڈا سے کم کوئی اُون قبول نہ کیجیے

۵۰ دلکش رنگوں میں دستیاب :- میرا - پارکو - سادھنا - کلاکار اور نوئیگ

اپنی پسند کے مطابق شیڈ طلب کیجیے

گوکل چند رتن چند وولن ملز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی • دھلی • امرتسر

نگار

ایڈیٹر اکبر علی خاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں
رسالہ جاری کر دیا جائے گا
نمائندہ نگار ۶۱۷ این سمن آباد لاہور

جلد (۴۲) | فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ (۸)

ملاحظات ۲
حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد - اسحاق البنی خاں ۴
بہار عجم کے مخطوطے پر خان آرزو کے حواشی - رازیزدانی ۱۴
خدا - ایک لسانی تحقیقی جائزہ - سید قدرت نقوی ۲۰
مآثر الامرا کی تاریخی فروگذاشت - سید نقی احمد ارشاد ۲۶
نواب مردان علیخاں رعنا (شاگرد غالب) - سید امیر حسن نورانی ۳۵
فورٹ ولیم کالج کی ایک ناقابل فراموش شخصیت
(شیخ اکرام علی) - ڈاکٹر احرار نقوی ۴۰
منظومات ۴۶
مطبوعات موصولہ ۴۷

ملاحظات

پچھلے مہینے تاریخ لطیف اور افادۂ تاریخ دو اہم کتابیں نگار کے تاریخ نمبر کی صورت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ان کی وجہ سے دو سلسلے منقطع کرنا پڑے۔ پہلا غالبیہ کا اور دوسرا اسحاق البنی خاں صاحب کے مقالے "حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" کا۔ ان میں سے دوسرے کو اس بار شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔

ہند و پاک کے ان لوگوں کو میں نے اس مقالے کی طرف توجہ دلائی تھی جو اسلامیات سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں یا دلچسپی رکھتے ہیں اور یہ درخواست کی تھی کہ خان صاحب اپنا جو نظریہ پیش کر رہے ہیں اس پر جرح و نقد کے ذریعے تلاش حق میں موصوف کی مدد فرمائیں۔ اس مقالے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ بظاہر اسلام کی ابتدائی تاریخ یعنی سیرۃ کی تاریخوں میں جو تضاد مختلف رواۃ سیرۃ کے ہاں نظر آتا ہے اور جس کو بنیاد بنا کر اکثر مستشرقین اسلامی تاریخ کی صداقت پر شک کا اظہار کرتے ہیں وہ غلط ہے۔ دراصل یہ تضادات غلط فہمیوں کا نتیجہ ہیں نہ تاریخ کے۔ یہ تضاد محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ وہ غلط فہمی کیا ہے اور اس کا ازالہ کس طرح ہوا ہے یہ آئندہ قسطوں میں نگار کے صفحات پر آئے گا۔

میں نے ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی تھی کہ ابھی جب تک یہ مقالہ مکمل طور پر سامنے نہ آجائے کوئی حکم نہ لگایا جائے لیکن میرے جو خطوط آئے ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان بزرگوں نے پچھلی قسط کو بہت جذباتی ہو کر پڑھا۔ اس میں سرے سے ہی یہ بحث نہیں آئی تھی کہ [illegible] اکرم اُمّی ہیں یا نہیں، بحث صرف یہ تھی کہ جس عرب معاشرے کو ہم قطعاً جاہل سمجھ رہے ہیں وہ علم سے اتنا ہی متلاشی یا بیگانہ تھا جتنا آج سے تیرہ سو سال پہلے کا کوئی بھی ملک ہو سکتا تھا۔ لیکن نو ۹۰ فی صد حضرات نے مجھے یہی لکھا کہ خان صاحب نے مسلمانوں کے ایک متفقہ عقیدے کو کہ [illegible]

اکرم امی تھے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے حلقے جن سے ہم بڑی بڑی توقعات وابستہ کرتے ہیں ایک مضمون سے صحیح نتائج بھی نہیں نکالتے، نکال سکتے کا میں استعمال نہیں کروں گا اس لیے کہ نکال تو سکتے ہیں۔ ان حضرات میں بہت پرانے خیال کے اسلام دوست بھی تھے اور بالکل نئے انداز سے سوچنے والے اسلام پسند بھی۔ مگر جذبات کو پورا پورا دخل دونوں کے ہاں تھا۔

اس بار میں پھر یہ درخواست کر رہا ہوں کہ مقالہ کا پیش نظر حصہ بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے مخالف یا موافق جو بھی باتیں ذہن میں آئیں انھیں نوٹ کرتے جائیں اور مقالے کی تکمیل پر مفصل اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ نگار کے صفحات اس کے لیے حاضر ہیں۔

آزاد یزدانی مرحوم نے نگار کے لیے ایک مسلسل مضمون لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی قسط ان کی زندگی ہی میں کتابت کی منزلوں سے گذر چکی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت اس بار آ رہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی دوسری کاوشیں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں وقتاً فوقتاً نگار کے ذریعے شائع ہوتی رہیں۔ مرحوم نے نظام رام پوری کا ایک مختصر سا انتخاب میری ہی درخواست پر کیا تھا جو عنقریب شائع ہو رہا ہے

کتاب خانۂ رام پور کے چند مختصر رسائل بحر البیان، رسالہ متروکات وغیرہ کو ایڈیٹ کیا تھا، بڑی محنت سے مقدمے اور حاشیے لکھے تھے۔ رامپور سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے وہ شیدائی تھے۔ پچھلے سال برادرم رشید حسن خاں استفادے کے لیے ان سے یہ مسودے اپنے ساتھ مستعار لے گئے تھے۔ رشید حسن خاں سے میں نے استدعا کی ہے کہ وہ مرحوم کے یہ مسودے مجھے عطا فرما دیں تاکہ ان کی محنت رائیگاں نہ جائے اور میں نگار کے ذریعے انھیں شائع کر سکوں۔ کچھ اور مقامین ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ جن میں "نوشی" کے مثنوی نمبر کے لیے ایک مضمون ہے نگار پاکستان کے نیاز نمبر کے لیے بھی ایک مضمون مرحوم نے لکھا تھا مگر وہ شریک اشاعت نہیں کیا گیا۔ یہ مضمون فرمان فتح پوری کی فرمائش پر لکھا گیا تھا، میں انھیں بھی لکھ رہا ہوں کہ مرحوم کی کاوشوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ مضمون مجھے واپس کر دیا جائے۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن

کی

ضروریات کی تکمیل کے لئے یاد رکھیے

حرفِ آخر

کپور سپن

KAPURSPUN

ہی ہے

تیار کردہ۔ کپور سپنگ ملز۔ ڈاک خانہ رآن اینڈ سلک ملز۔ امرت سر

حل التضاد فی تواریخ سیر خیر العباد

(تواریخ سیرۃ کا تضاد اور ان کا حل)

مقالہ اوّل

(فصل سوم)

اسحاق النبی خاں

اس نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد کہ ظہور اسلام کے وقت عربی معاشرے میں نہ تو تعلیم کی غیر معمولی کمی تھی، نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا فقدان تھا، تصنیف و تالیف کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ترجمے ہو رہے تھے اور تقریباً ہر شعبہ حیات میں تعلیم نے وابستگی حاصل کر لی تھی۔ قدرتی طور پر ہماری نگاہیں خود عہد رسالت اور اس کے متصل زمانے کے مکتوبی باقیات کی تلاش میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اور ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ جس قوم میں شروع ہی سے یہ صلاحیتیں موجود تھیں وہ تحریک اسلام سے متاثر ہونے کے بعد معطل ہو گئیں اور رد و بکار نہ آسکیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے اپنی موت و حیات کی اس عظیم کشمکش کا بھی کوئی ادنیٰ ریکارڈ نہیں چھوڑا جس سے اس دور میں وہ دوچار ہوئے تھے۔

میرا مطلب عہد رسالت کی تاریخ سے ہے جس کے متعلق بعض علما کا خیال ہے کہ یہ تمام تر زبانی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ سر سید سے زیادہ وکالت اسلام کا شرف کم لوگوں کو حاصل ہوگا۔ مگر کتب سیرۃ کی تدوین پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھتے ہیں:۔

"ان کی (یعنی سیرۃ نگاروں کی) تحریرات کا سب سے بڑا خزانہ زبانی روایتیں تھیں، جس کسی نے جو قصہ ان سے بیان کیا، انھوں نے نہایت اشتیاق سے اس کو سنا۔ اور اس قصے کی اصلیت اور راوی کے چال چلن کے متعلق ذرا بھی تفتیش نہیں کی اور اس قصہ کو اپنی کتاب میں لکھ لیا۔" [1]

سر سید کی رائے میں یہ افسانے بھی کسی قریب العہد مصنف کے قلم سے نہیں نکلے بلکہ ان کی تدوین میں بھی صدیاں گذر گئیں، "اور تقریباً دو سال لگاتار شاہد و گواہ ختم ہو گئے۔ ان کے بیٹے، پوتے، پرپوتے بھی چل بسے، پانچویں اور چھٹی پشت بھی ختم ہو گئی، تب کہیں جا کر مسلمانوں میں شعور تصنیف پیدا ہوا چنانچہ ان روایات کے سلسلے میں ان کا خیال یہ ہے:۔

"اس زمانے میں جس تصنیف عرب میں محض ایک ابتدائی حالت میں تھا، اس وقت میں ایسی باتوں کے لیے حافظہ بہترین مخزن خیال کیا جاتا تھا۔ ان اسباب سے نبوت سے دو سو برس تک اور ہجرت سے دو سو برس قریب تک حدیثوں کا قلمبند ہونا عمل میں نہیں آیا۔" [2]

ان رائے قلت پسند یا کسی فرسودہ ذہنی عجائب پرست کی نہیں، بلکہ ایک محقق کی ہے، اور اتنے بے خوف محقق کی ہے، جس کی زبان قلم اظہار خیال میں کبھی نہ جھجکی، نہ رکی، اور بلا کسی ادنیٰ تکلف کے ہمیں جدید طرز فکر اور نئے تصورات سے روشناس کیا۔

سر سید کی عظمت ایک طرف، اور واقعات و حقائق دوسری طرف۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی مسلمانوں کے پاس عہد رسالت کی کوئی مستند تاریخ نہیں؟ کیا حقیقتاً سیرۃ کی کتابوں کے اصل ماخذ وہ افسانے ہیں زبانی روایتوں کے ذریعے سیرت نگاروں کو پہنچے تھے، اور انھوں نے بلا کسی تحقیق و تفتیش کے ان کو قبول کر کے مدون کر لیا تھا؟

اس سلسلہ میں غالباً یہ موزوں ہوگا کہ یہاں ہم قدیم سیرۃ کی کتابوں کی داخلی شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے ابتدائی ماخذوں کا ایک مختصر جائزہ لیں، اور اس کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ روایات سیرت کی تاریخی منزلت کیا ہے؟ اور وہ کس درجہ قابل اعتماد ہیں۔ ان کتابوں کا اگر بغور اور محتاط مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل پانچ ماخذ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید۔

۲۔ عہد رسالت کے سرکاری اور دفتری ریکارڈ۔

---

[1] خطبات احمدیہ / ۳۳۳

[2] ایضاً / ۳۲۲

۳۔ اسی عہد میں صحابہ نے جو نجی یادداشتیں مرتب کیں۔
۴۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد صحابہ کی قلمی کاوشیں۔
۵۔ تابعین کا وہ سرمایۂ تاریخ جو صحابہ کی مدد سے اکٹھا کیا گیا۔

یہاں میں علی الترتیب ان ماخذوں کی تاریخی اہمیت علیحدہ علیحدہ پیش کرتا ہوں۔

پہلا ماخذ سب سے پہلے قرآن کو لیجیے، جو مسلمانوں کے نزدیک اگرچہ کلام الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا مرتبہ رکھتا ہے، مگر اس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ اس مقدس صحیفے کی کتابت نہایت ہی ابتدائی زمانے سے شروع ہو گئی تھی۔ پھر یہ کہ اس کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو خاص پیغمبر اسلام کی زبان سے نہ نکلا ہو، یا اس میں کوئی خفیف سی بھی تبدیلی کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے نہ صرف آنحضرت کے تمام تصورات، عقائد، رجحانات اور عزائم کا ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ تحریک اسلام کی اصل روح بھی سامنے آجاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس زمانے کی سماجی ضروریات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ واقعاتِ سیرۃ کو سمجھنے کے لیے قرآن سے بہتر کوئی دوسرا ماخذ نہیں۔

یہ سچ ہے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں اور اسی لیے اس میں تاریخی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا، جو تاریخ نویسی کے لیے سب سے ضروری شے ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنحضرت کی پوری زندگی کا شاید ایک بھی اہم واقعہ ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن میں ٹھیک وقت پر کوئی بیان نہ دیا گیا ہو، یا اس کی مناسب توجیہ نہ کی گئی ہو۔ تقریباً تمام اہم غزوات کے متعلق قرآن میں واضح بیانات ہیں حتیٰ کہ آنحضرت کی نجی اور خانگی زندگی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں، اسی لیے سیرۃ کی قدیم کتابوں میں اس کے حوالے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اور آج بھی کوئی سیرۃ نویس اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دوسرا ماخذ قرآن کے بعد دوسرا نمبر ان سرکاری ریکارڈوں کا ہے جو خاص عہد رسالت میں مرتب ہوئے تھے، مثلاً آنحضرت کے مکاتیب، معاہدات، اور فرامین وغیرہ، جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور اس تعداد سے اس زمانے کے سیاسی انتشار اور عرب قبائل کی لامرکزیت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اس قسم کی جملہ دستاویزیں انتہائی قیمتی اور قابل اعتماد ماخذ تصور کی جاتی ہیں۔ جن سے اس زمانے کے اکثر سیاسی اور سماجی مسائل خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان دستاویزوں کو اصلی کہا جا سکے۔ اور ان کے اصل متن ہمارے سامنے ہوں۔ چنانچہ علمائے سیرت نے شروع سے ان بیش بہا، دستاویزوں کو محفوظ کرنے کی پوری کوشش کی تھی، نیز موقع بہ موقع ان کا تذکرہ کیا ہے، بلکہ اصل عبارتیں تک نقل کی ہیں۔ چوں کہ یہ دستاویزیں بجائے خود بھی ایک تاریخ کا مرتبہ رکھتی تھیں۔ اس لیے غالباً دوسری صدی کے اختتام سے پہلے ان کو یکجا جمع کرنے کے اقدامات شروع ہو گئے تھے، ابن ندیم نے مدائنی (۱۳۵ھ۔ ۲۱۵ھ) کی متعدد تصنیفات کا تذکرہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل کتابوں کے نام بھی گنائے ہیں:۔

۱۔ کتاب عہود النبی
۲۔ کتاب رسائل النبی
۳۔ کتاب کتب النبی الی الملوک
۴۔ کتاب من کتب لہ النبی کتاباً و اباناً۔[1]

ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدائنی کے زمانہ (یعنی دوسری صدی میں) ان قدیم دستاویزوں نے کتابی صورت اختیار کر لی تھی، اور ان میں سے سب کو نہیں تو اکثر کو ایک جگہ جمع کر لیا گیا تھا۔

میور نے خود واقدی کے متعلق بیان کیا ہے کہ ان کی (Biography) میں ایک مستقل باب خاص ان معاہدات کے متعلق ہے۔ جس میں تقریباً دو یا تین بیسی (Two or Three Score) معاہدات کی نقلیں موجود ہیں۔ بقول میور یہ نقلیں اس طرح کی گئی ہیں کہ ان میں

---

[1] ابن ندیم (اخبار المدائنی) ۱۴۷

سے اکثر دستاویزوں کو یا تو خود واقدی نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا یا اس کے کسی راوی نے بچشم خود دیکھ کر نقل کیا تھا[1]۔ میرے سامنے واقدی کا یہ باب نہیں، البتہ واقدی کے شاگرد خاص ابن سعد نے اپنی مشہور کتاب طبقات کی تیسری جلد میں بھی ان دستاویزوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو میرے پیش نظر ہے، انہیں مجھے صرف دو تحریریں ایسی مل سکیں جو واقعی واقدی کی نظر سے گذری تھیں[2]۔ اور معلوم ہوتا ہے ان کا لفظ لفظ اصل دستاویزوں سے نقل کیا گیا ہے۔

ابن سعد نے اس باب میں لگ بھگ سو مکتوبات اور معاہدے نقل کیے ہیں، اور ہر مکتوب یا معاہدے سے پہلے بطور تعرف تقریباً ایک ہی قسم کے الفاظ تحریر کیے ہیں۔ مثلاً، اور اہل علم بیان کرتے ہیں[3]۔ اور علماء کا بیان ہے[4]۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن سعد کے عہد تک مدائنی کے علاوہ دوسرے علماء بھی اس موضوع پر کتابیں لکھ چکے تھے، جو ابن سعد کے پیش نظر تھیں۔ ورنہ صرف مدائنی یا واقدی کا حوالہ کافی ہوتا۔

قدیم مورخین کو ان قیمتی دستاویزوں کی نقلیں کہاں سے ملیں، اور کس طرح ان کو جمع کیا گیا؟ اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ قیاس غالب یہ ہے کہ یا تو یہ سرمایہ سرکاری دفاتر کے ریکارڈوں سے نقل کیا گیا ہوگا یا پھر ان قبائل کے قبضے سے مورخین تک پہنچا ہوگا جن کے حق میں یہ تحریریں لکھی گئی تھیں۔ عہد رسالت میں دستور تھا کہ معاہدات کی دو نقلیں ہوتیں ایک۔ مدینہ میں رہتی اور دوسری فریق متعلقہ کے پاس۔ بہرصورت ان میں سے جو بات بھی ہو اتنا یقینی ہے کہ ان دستاویزوں کا بڑا حصہ ایک مدت مدید تک اصل حالت میں محفوظ رہا جس کی وجہ غالباً ایک یہ بھی تھی کہ ان فرامین اور معاہدات میں مختلف قبائل کو جو مراعات دی گئی تھیں، ان پر مسلسل عمل ہوتا رہا تھا۔

اشپرنگر کا خیال ہے کہ ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں بھی ان پر پورا عمل ہوتا رہا تھا[5]۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یہ جملہ دستاویزیں سیرۃ کا ایک اہم ماخذ تھیں۔ جو ہمارے سیرۃ نگاروں کے سامنے رہیں، اور آج بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بشرطیکہ ہمیں ان کی صحت کا یقین ہوسکے؛ میرا خیال ہے کہ اگرچہ ان کا بڑا حصہ صحیح اور اصلی ہے، لیکن انمیں بعض مکتوبات ایسے بھی ہیں جن کی اصلیت بڑی حد تک مشکوک ہے، اور بعض صاف طور پر اصل دستاویزوں کا خلاصہ معلوم ہوتے ہیں۔

ابن ندیم کا بیان ہے کہ ان دستاویزوں میں سے چند اس کے زمانے تک محفوظ تھیں جن کو اس نے ایک پرانی کتابوں کے شوقین کے پاس بچشم خود دیکھا تھا[6]۔

ان دستاویزوں کے علاوہ، عہد رسالت کے سرکاری ریکارڈوں میں وہ رجسٹر بھی کم اہمیت نہیں رکھتے جو مختلف اغراض کے تحت اس زمانہ میں مرتب ہوتے رہے تھے، فصل دوم میں بیان کیا جاچکا ہے (دیکھیے نگار جون ۶۳ء) کہ عہد رسالت میں ایک جنرل رجسٹر بھی موجود تھا جس میں تمام مسلمان مردوں کے نام درج تھے، غزوات و سرایا کے سلسلے میں جو رجسٹر مرتب ہوئے، ان کا بھی ذکر آچکا ہے (دیکھیے نگار جون ۶۳ء) یہاں مجھے صرف اتنا اضافہ کرنا ہے کہ عہد رسالت میں غالباً ان رجسٹروں کو "کتاب حافظ" کہا جاتا تھا۔ کعب بن مالک جو نہایت قدیم الاسلام صحابی ہیں اور تقریباً ہر غزوے میں بجز غزوۂ تبوک کے شریک رہے، کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں آنحضرت کے ہمراہ مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کے نام "کتاب حافظ" (یعنی دیوان میں) نہ آسکے تھے[7]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے علاوہ باقی تمام غزوات میں یہ "کتاب حافظ" ضرور تیار ہوتی۔ گمان غالب ہے کہ ابتدائی رواۃ یا مدونین سیرۃ کے سامنے یہ مواد پورا کا پورا موجود تھا جسکو پیش نظر رکھ کر شریک غزوات صحابہ، یا مقتول و مجروح مجاہدین) کی انھوں نے نام بنام نشاندہی کی تھی اور صحیح اعداد و شمار بیان کیے تھے۔

مثال کے طور پر ابن اسحٰق نے بڑی تفصیل کے ساتھ شرکاء بدر کے سیکڑوں نام معہ ولدیت اور خاندان بیان کیے ہیں[8]۔ جنگ احد کے ایک ایک، مقتول اور مجروح سپاہی کی نام بنام فہرست پیش کی ہے[9] اس طرح دوسرے غزوات میں جو مجاہدین شہید ہوئے ان کی مکمل فہرستیں کتاب میں

---

[1] MUIR LIFE xxii [2] MUIRLIFE xxii [3] طبقات ۲/۳ [4] ابن ندیم/۷۱ [5] والمسلمون مع رسول اللہ کثیر ولا یجمعھم کتاب حافظ یرید دیوان (کتاب المغازی) [6] ابن ہشام/ [7] ابن ہشام/

شامل ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق کو یہ جملہ تفصیلات کہاں سے ملیں، اور کس نے ان طویل فہرستوں کو پوری تفصیلات کے ساتھ روایت کیا تھا؟ اس کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں، کیوں کہ خود ابن اسحٰق بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ فہرستیں بلا کسی تحریری ریکارڈ کے ممکن نہیں، اور اگر اس قسم کے ریکارڈوں کا تذکرہ تاریخ میں موجود نہ ہوتا تو ہمیں حق پہنچتا تھا کہ ان تمام تر تفصیلات کو مشکوک نظروں سے دیکھیں اور تنقیدی اصولوں کو سامنے رکھ کر اس بات کی تلاش کریں کہ اس فہرست سازی میں کن کن اغراض کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ مگر ان رکاوٹوں کی موجودگی میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے، کہ یہ تفصیلات شاید ان پچھلے ریکارڈوں سے ماخوذ ہوں گی جن کو ابن اسحٰق کے کسی ابتدائی راوی نے بچشم خود دیکھ کر نقل کیا تھا؛

اسی طرح ابن اسحٰق نے بلا کسی ادنیٰ حوالے کے مقاسم خیبر کی تفصیل دی ہے، اور خاص خاص لوگوں کو جو عطیات دیئے گئے تھے ان کے نام گنائے ہیں۔ اس فہرست میں عطیات کے اوزان تک کا خیال رکھا گیا ہے، میں یہاں ان کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں جو اگرچہ تھوڑا طویل اور اکتا دینے والا ہے۔ تاہم معاملے کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس پر نظر رکھنا ضروری ہے، ابن اسحٰق کہتے ہیں:-

"پھر آنحضرت نے کتیبہ کو جس کا تعلق خاص وادی سے تھا، اپنے رشتہ داروں اور ازواج کے درمیان تقسیم فرمایا، اور چند مسلمان مردوں اور عورتوں کو بھی اس میں سے عطیات دیئے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اپنی صاحبزادی فاطمہؓ کو دو سو وسق دیئے اور علی بن ابی طالب کو ایک سو وسق اور اسامہ بن زید کو دو سو اور پچاس وسق کھجوریں، اور ام المومنین عائشہ کو دو سو وسق اور حضرت ابوبکر کو سو وسق، اور عقیل بن ابی طالب کو ایک سو چالیس وسق اور جعفر کی اولاد کو پچاس وسق، اور ربیعہ بن حارث کو سو وسق، اور صلت بن مخرمہ کو معہ ان کے دونوں بیٹوں کے سو وسق اس طرح کہ صلت کے چالیس اور ابی نیقہ کے پچاس، اور رکانہ بن عبد یزید کو پچاس وسق اور قیس بن مہ کو تیس اور عبیدہ بن حارث کے بیٹوں اور ان کے بیٹے حصین بن حارث کو ستر وسق، اور بنی عبید بن عبد یزید کو ساٹھ اور اوس بن مخرمہ کے بیٹے کو تیس وسق اور مسطح بن اثاثہ اور الیاس کے بیٹے کو پچاس وسق اور ام رمیثہ کو چالیس وسق اور نعیم بن مسعود کو تیس، اور بجینہ بنت حارث کو تیس وسق، اور عجیر بن عبد یزید کو تیس وسق اور ام حکیم کو تیس وسق اور جمانہ بنت ابی طالب کو تیس وسق اور ابن ارقم کو پچاس اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو چالیس، اور رحمہ بنت حمش کو تیس وسق اور زبیر کی ماں کو چالیس وسق اور صاعۃ بنت زبیر کو چالیس اور ابن مخیس کو تیس وسق اور ام طالب کو چالیس وسق اور ابی لصبرہ کو بیس اور نمیلہ کلبی کو پچاس وسق اور عبداللہ بن وہب کو مع ان کے دونوں بیٹوں کے نوے وسق جن میں سے بیٹوں کے چالیس تھے اور ام حبیب حجش کو تیس وسق اور ملکون عبدہ کو تیس وسق اور اپنی کل ازواج کو ۷۰۰ وسق عطا فرمائے۔" [1]

ان تفصیلات کو دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ تو شاید کوئی بھی نہیں نکال سکے گا، کہ ابن اسحٰق نے اس فہرست کو کسی کتاب یا دستاویز سے نقل کیا ہے اور یہ جملہ تفصیلات محض زبانی روایت کا نتیجہ ہیں۔ کیوں کہ اول تو روایت کی ساخت سے یہ اندازہ نہیں ہوتا، کیوں کہ ذہن انسانی سو سوا سو سال تک ان غیر اہم اور غیر متعلق تفصیلات کو یاد رکھنے سے قاصر ہے اور اگر بالفرض اس کا امکان بھی تسلیم کر لیا جائے تو شاید مصنف اس فہرست کے راوی کا حوالہ ضرور دیتا، جیسا کہ دوسری روایتوں کے سلسلے میں التزام ہے، اسی طرح یہ نتیجہ نکالنا بھی ممکن نہیں کہ یہ تمام تفصیلات خود ابن اسحٰق کی خود ساختہ یا بالفاظ دیگر محض تخیلی ہیں کیوں کہ ان سے نہ تو کسی خاص عقیدے کی تائید ہوتی ہے، اور نہ کسی غیر معمولی واقعہ کی طرف ہمارے ذہن منتقل ہوتے ہیں، پوری فہرست میں مشاہیر کے نام محض گنتی کے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ تمام نام فرضی نہیں، بلکہ اصلی ہیں انسان کے بیان کرنے سے مصنف کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ (کم سے کم) متذکرہ مال غنیمت کی تقسیم تحریری صورت میں ہوئی تھی۔ یحییٰ بن آدم جو دوسری صدی کے مشہور فقہا اور محدثین میں ہیں، اپنی کتاب الخراج میں بشر بن یسار کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں،

"فکتب فیھا رسول للناس وکان لازواجہ من ذالک" [2]

---

[1] ابن ہشام ؟ [2] کتاب الخراج ص ۱۱۹ قاہرہ

بنا بریں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے یہ جملہ تفصیلات عہد رسالت کے کسی سرکاری یا دفتری ریکارڈ سے نقل کی گئی ہیں خواہ اسکی نقل کسی اہل قلم صحافی کی یا کسی مخفی تابی بہر صورت ابن اسحٰق کو یہ روایت مکتوبی صورت میں پہنچنا چاہیے سیرۃ کی کتابوں میں اس قسم کی اور متعدد مثالیں موجود ہیں، جن کو میں یہاں ترک کرتا ہوں۔

تیسرا ماخذ سرکاری ریکارڈوں کے بعد کتب سیرۃ کا سب سے اہم ماخذ صحابہ کی وہ تحریریں کہی جاسکتی ہیں جو خاص عہد رسالت میں مرتب ہوئیں اور جن کو تاریخی نقطۂ نظر سے معاصرین اور چشم دید گواہوں کی شہادتوں کا مرتبہ حاصل ہے!

ان تحریرات کا پتہ نہ صرف روایات سیرۃ کی بنا وٹ اور پرداز بیان سے چلتا ہے بلکہ تاریخ کی کتابوں میں ان کے متعدد حوالے اور تذکرے موجود ہیں۔ جن پر ہمیں بڑی احتیاط اور غور وفکر کے ساتھ نظر ڈالنا چاہیے، تاکہ بے جا افراط وتفریط سے بچ سکیں، چونکہ یہی ماخذ ایسے ہیں جن پر واقعاتی تفصیلات کا بیشتر مدار ہے۔ اس لیے میں یہاں تھوڑی تفصیل سے کام لوں گا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں متعدد صحابہ آنحضرت کے احکام افعال اور واقعات کو ضبط تحریر میں لاتے رہتے تھے، ان میں سے اکثر کی یادداشتیں غالباً بہت مختصر ہوتیں، اور یہ لوگ خاص خاص امور کے متعلق کچھ نوٹ کر لیتے اس لیے ان پر لفظ تالیف یا تصنیف کا اطلاق مشکل ہے؛ تاہم کئی اہل قلم ایسے بھی تھے جن کے پاس ضخیم مجموعوں کا پتہ چلتا ہے اور انھیں اس عہد کی کتابیں یا تالیفات کہنا بیجا نہ ہوگا؛ ان میں سے کم سے کم ایک کتاب کا نام بھی اوراق تاریخ میں محفوظ ہے، یعنی "صادقہ" کا جس کا میں آئندہ تفصیلی تذکرہ کروں گا۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس قسم کی تحریرات کا تعلق صرف مدینے کے رہنے والے صحابیوں تک محدود تھا۔ جو پیغمبر اسلام کی ذات اور شخصیت سے خاص طور پر متاثر تھے اور ان کے وسائل حیات کا تعلق بھی اسلامی تحریک کی کامیابی سے وابستہ ہو چکا تھا، جس کی بنا پر یہ ہمہ وقت دربار نبوت میں حاضر رہتے، اور آپ کے ایک ایک حکم اور ایک ایک عمل کا بغور مطالعہ کرتے۔ یہ خیال اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے مگر پھر بھی تھوڑی ترمیم کا محتاج ہے کیونکہ اسلام کی ہمہ گیر قوت انجذاب نے گرد وپیش اور دور ونزدیک کے قبائل کو بھی اتنا ہی متاثر کیا تھا جتنا خود اہل مدینہ کو۔

جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس کے سربراہ مدینے آتے، اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر اس عجیب وغریب شخصیت کے ویسے ہی دلدادہ ہو جاتے جیسے مدینے والے تھے، مسلمان ہونے کے بعد ان کے تمام تر روحانی اور مادی وسائل کا واحد حل مرکز ثقل صرف آنحضرت کی ذات گرامی بن جاتی اور مدینے سے دینی، سیاسی، اور معاشی رشتے قایم ہو جاتے، جن کا ریکارڈ نہ صرف سرکاری طور پر ضروری تھا، بلکہ افراد متعلقہ کے لیے بھی عین سعادت تھی۔

خوش قسمتی سے اوراق تاریخ میں کم سے کم دو شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مدینے سے باہر بھی اس قسم کی تحریریں لکھی جاتی تھیں اور بعض قبائل میں بڑے عرصے تک یہ اپنی اصل شکل وصورت میں باقی رہیں۔ میرا مطلب بنو عذرا اور سلامان کی تحریری یادداشتوں سے ہے جن کا تذکرہ بصراحت ابن سعد نے کیا ہے۔ یہ دونوں قبیلے ۹ھ اور ۱۰ھ میں علی الترتیب اسلام لائے تھے۔ ان میں سے پہلے بنو عذرا کی یادداشت ملاحظہ ہے جو ایک عذری نے اپنے بزرگوں کے باقیات میں دیکھی تھی اور گویا بنو عذرا کے مسلمان ہونے کی کہانی خود انکی زبانی ہے، عمر بن حریث العذری کہتے ہیں کہ میں اپنے بزرگوں کے ایک مکتوب میں دیکھا کہ صفر ۹ھ میں رسول اللہ کے پاس ۱۲ آدمیوں کا ایک وفد آیا جس میں حمزہ بن نعمان العذری اور مالک کے دونوں بیٹے سلیم اور اسد بھی موجود تھے، اور مالک بن رباح بھی؛ یہ لوگ رملہ بنت الحارث النجاریہ کے مکان میں مقیم ہوئے، نبی علیہ السلام کے پاس پہنچے تو جاہلی سلام کیا، اور کہا کہ ہم لوگ قصی کے اخیافی بھائی ہیں۔ ہمیں نے خزاعہ اور بنو بکر کو مکے سے نکالا تھا اور ہماری آپ سے قرابت داری اور رشتے ہیں۔

رسول اللہ نے فرمایا مرحبا واہلاً۔ مجھ سے کسی نے تمہارا تعارف نہ کرایا تمہیں اسلامی سلام سے کس بات نے روکدیا ان لوگوں نے کہا کہ ہم اپنی قوم کی فکر میں آئے ہیں۔

بعد ازاں آنحضرت سے چند دینی باتیں دریافت کیں۔ جن کی آپ نے تشریح کی، تو سب مسلمان ہو گئے چند روز

قیام کے بعد اپنے عیال میں واپس آگئے۔

آنحضرت نے انھیں اسی طرح انعام واکرام سے نوازا جس طرح آپ دوسرے مومنوں کو نوازتے تھے۔ ایک شخص کو آپ نے چادر بھی مرحمت فرمائی۔" [1]

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حریث کے سامنے ان کے بزرگوں کی لکھی ہوئی کوئی نہ کوئی یادداشت موجود تھی جس کا خلاصہ اور نچوڑ انھوں نے اپنے لفظوں میں دہرایا ہے، اور صرف ایک ہی واقعہ یعنی اسلام بنو عذرا کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر اتنی مختصر نہ تھی اور اس میں کچھ اور باتیں بھی ہوں گی۔ جن کو خارج از بحث سمجھ کر قصداً ترک کر دیا گیا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ اپنے اسلام لانے کی داستان کو تحریری صورت میں محفوظ رکھتے تھے ان کے سامنے دوسرے مسائل اور دوسری قابل تحریر باتیں بھی ہیں۔

حریث کے بیان میں صفر ۹ھ کا حوالہ، بعد کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی خود حریث کے زمانے کا جبکہ سنہ ہجری رائج ہو چکا تھا۔ اس لیے اصل دستاویز میں یہ صراحت ممکن نہیں، سنہ ہجری کا اجرا خلیفہ ثانی کے عہد کا واقعہ ہے۔

اب بنو سلامان کی یادداشت پر نظر کیجیے، یہ بھی اگرچہ ایک طویل دستاویز کا مختصر حصہ معلوم ہوتی ہے مگر اس کی عبارت سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ اصل دستاویز سے لفظاً لفظاً نقل کی گئی ہے۔

محمد بن یحییٰ بن سہیل بن ابی حثمہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد کی تحریرات میں دیکھا کہ

"حبیب بن عمرو السلامانی بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ وفد بنی سلامان میں رسول اللہ کے پاس آئے۔ ہم سات آدمی تھے۔ رسول اللہ کے پاس پہنچے تو آپ مسجد سے نکل کر ایک جنازے میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ جس کی طرف آپ نے مدعو کیا تھا۔ ہم نے کہا السلام علیک یا رسول اللہ" تو آپ نے "وعلیکم" کہہ کر جواب دیا (پھر فرمایا) تم کون ہو؟ عرض کی کہ ہم بنو سلامان سے ہیں اور اس لیے آئے ہیں کہ آپ کی اسلام پر بیعت کریں کہ ہم پسماندگان میں سے ہیں اور ان کے نمائندے ہیں۔

آنحضرت اپنے غلام ثوبان کی طرف بڑھے اور فرمایا کہ اس وفد کو بھی وہیں ٹھہراؤ جہاں دوسرے قیام کرتے ہیں۔ نماز ظہر کے بعد آپ اپنی رہائش گاہ اور منبر کے درمیان تشریف فرما ہوئے تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے، نماز اور شریعت اسلام اور جھاڑ پھونک کے متعلق سوالات کیے۔

آپ نے ہم میں سے ہر شخص کو پانچ پانچ اوقیہ چاندی عطا فرمائی اس کے بعد ہم اپنے گھروں کو واپس آگئے۔

یہ واقعہ شوال ۱۰ھ کا ہے۔" [2]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس روایت کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنو سلامان کے وفد نے جب بار یابی حاصل کی تھی تو یہاں سے واپسی کے بعد، حبیب بن عمرو السلامانی نے جو اس وفد کے لیڈر معلوم ہوتے ہیں، مدینے کی پوری روداد یحییٰ بن سہیل کو سنائی جنھوں نے اس کو قلمبند کر لیا، اور اس کے بعد ان کے لڑکے محمد نے اصل دستاویز سے نقل کر کے متلاشیان تاریخ کے حوالے کیا، آخری نوٹ یعنی یہ واقعہ شوال ۱۰ھ کا ہے۔" حریث کی طرح یا تو خود محمد بن یحییٰ کا ہے، یا کسی سیرۃ نگار کا۔

بنو عذرا کی یادداشت کی طرح غالباً یہ دستاویز بھی مختصر نہ تھی، بلکہ شاید طویل تھی محمد نے صرف وہی حصہ نقل کیا ہے جس کا تعلق بنو سلامان کے اسلام لانے سے تھا۔

ان دونوں دستاویزوں کو مثال قرار دے کر یہ بات پوری قطعیت سے کہی جا سکتی ہے، کہ سیرۃ کی کتابوں میں کم سے وفود و قبائل کے سلسلے میں جو تفصیلات موجود ہیں وہ اگر سب نہیں تو بیشتر اسی قسم کی یادداشتوں کا نتیجہ ہیں جو خاص مدینے میں بھی ریکارڈ ہوئیں تھیں اور متعلقہ

---

[1] ابن سعد ۳/۶۶ [2] ابن سعد ۳/۶۷

قبائل میں بھی ان کو تبرکاً محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

یہ بات قطعاً خلاف قیاس ہے کہ اس قسم کی یادداشتیں صرف بنو عذرا اور بنو سلامان نے ہی تحریر کی تھیں، اور دوسرے قبائل نے جو میدان تعلیم اور سیاسی شعور میں ان سے آگے تھے کوئی تحریری ریکارڈ نہ چھوڑا ہوگا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں ملک کے طول وعرض میں روایات سیرت کا ایک معتدبہ حصہ غالباً تحریری صورت میں موجود تھا۔

اب میں قارئین کی توجہ خاص مدینے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو مرکز اسلام تھا اور جہاں چند در چند ضروریات کے تحت آنحضرت کے اقوال و احکام اور حالات تحریری یادداشتوں کی صورت میں منتقل ہو رہے تھے، افراط تحریر کا یہ عالم تھا کہ (کم سے کم ایک بار) خود آنحضرت نے بعض صحابہ کو حکم دیا کہ قرآن کے سوا کچھ نہ لکھیں اور اگر کسی نے لکھ لیا ہے تو اس کو مٹا دے۔ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے (دوبارہ) اجازت چاہی تو انکار کر دیا گیا۔[1]

اس سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں صحابہ کی ایک جماعت کثیر اس کام میں مشغول تھی۔ جن میں بہت سے بے احتیاط اور کم سوجھ بوجھ کے افراد بھی شامل تھے۔ لیکن محتاط اور صاحب شعور افراد کی بھی کمی نہیں تھی، اور تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو آج بھی درجنوں صحابہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں جن کے پاس چھوٹے بڑے صحیفے موجود تھے، بلکہ بعض نے تو شاید مستقل تصنیفیں چھوڑی تھیں۔

ان میں سے چند اکابر صحابہ کے نام بطور مثال پیش کرتا ہوں جن کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان مصنفین نے خاص پیغمبر اسلام کی حیات میں اوقات یا تعلیمات کے متعلق کچھ نہ کچھ تحریر کیا تھا مثلاً:

سعد بن عبادہ[1]، جابر بن عبداللہ[2]، عبداللہ بن مسعود[3]، سمرہ بن جندب[4]، رافع بن خدیج[5]، ابو موسیٰ اشعری[6]، ابو رافع[7]، عبداللہ بن عمرو بن عاص[8]، انس بن مالک[9] وغیرہ۔

ان میں دو آخر الذکر ایسے صحابیوں کے نام ہیں جن کی تالیفات کو آنحضرت کا شرف قبول بھی حاصل تھا۔ باقی کتابوں کے متعلق ایسی کوئی شہادت ہمارے علم میں نہیں جس کی بنا پر ان کو زمانہ بعد کی تصنیف قرار دیا جائے بہر صورت یہ پورا لٹریچر تابعین کے عہد تک ہر طرح محفوظ تھا اور اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

سعد بن عبادہؓ کی کتاب کا حوالہ ترمذی میں موجود ہے اور اگرچہ اس کے اصل موضوع کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب انتہائی بلند پایہ ہوگی، سعد نہ صرف خزرج کے رئیس اور انصار کے چوٹی کے لوگوں میں تھے، بلکہ تعلیمی اعتبار سے بھی ان کی شخصیت بہت بلند تھی، مدینے کی سب سے اونچی تعلیمی ڈگری یعنی "سند کاملیت" ان کے پاس تھی۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور اثر و رسوخ کی کیفیت یہ تھی کہ آنحضرت کی رحلت کے بعد ابوبکر صدیق کے مقابلے میں منصب خلافت کا کوئی دوسرا امیدوار کھڑا ہو سکتا تھا، تو وہ صرف سعد بن عبادہ کی ذات تھی۔ ترمذی کی اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں غالباً بعض قانونی مسائل تھے سعد کے ایک صاحبزادے کے بقول گواہ کو حلف دینے کا مسئلہ[3] اس کتاب میں موجود تھا۔

اسی طرح جابر بن عبداللہ کی کتاب بھی مدتوں تابعی علماء کے زیر مطالعہ رہی۔ اس صحیفے کی منزلت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قتادہ کو سورہ بقر پر اتنا عبور نہ تھا جتنا اس صحیفے پر[4] حسن بصری کے مطالعہ میں بھی یہ کتاب رہی، کہا جاتا ہے کہ ان کی روایات کا ایک ماخذ یہ صحیفہ بھی تھا۔[5]

---

[1] عن ابی سعید الخدری، ان النبیؐ قال لا تکتبوا عنی شیئاً الا القرآن. فمن کتب عنی شیئاً فلیمحہ القرآن

[2] ..... عن ابی سعید الخدری، انھم استاذنوا النبی فی ان یکتبوا عنہ فلم یاذن لھم۔

[3] قال ربیعہ واخبرنی ابن اسعد بن عبادۃ قال وجدنا فی کتاب سعد ان النبی قضی بالیمین مع الشاھد (ترمذی کتاب الاحکام ۸۹/۶)

[4] التاریخ الکبیر ۱۸۲/۴ [5] کفایہ / ۳۵۴

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ہم جابر سے اکثر سنن رسول اللہ کے متعلق باتیں دریافت کرتے اور ان کو لکھ لیتے تھے[1] وہب بن منبہ نے بھی جو مشہور مصنف ہیں ان سے روایات کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیفہ جابر کو خود ان کی حیات میں کئی مشہور مصنفین نے نئے نئے جنم دیئے اور اپنے پاس اس کے اقتباسات کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

اس سلسلے میں عبداللہ بن مسعود کی کتاب بھی قابل ذکر ہے اور اگرچہ اس کے اصل موضوع و تفصیلات کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ بڑے عرصے تک ان کے خاندان میں محفوظ رہی، معن کہتے ہیں کہ ایک بار ان کے بیٹے عبیداللہ نے جب یہ کتاب مجھے دکھائی، تو قسم کھا کر کہا کہ یہ صحیفہ خود ان کے والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے[2]۔

عبداللہ بن مسعود قرآن کے بہت بڑے عالم تھے، ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب صرف قرآن پر ہو؛ یا اس کی تشریحات پر بہرصورت اس میں کوئی ایسا لفظ نہیں، جس سے اس کتاب کے اصل موضوع کا پتہ چل سکے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ عبداللہ سے بہت سی روایتیں منقول ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کا تعلق روایات سے ہو؛

کہتے ہیں کہ سمرہ بن جندب کی کتاب بھی تابعی علما کے لیے بڑی حد تک باعث کشش رہی یہ کتاب ان کے بیٹے سلیمان کو ورثہ میں پہونچی ابن سیرین کا بیان ہے کہ سلیمان نے اپنے والد کے حوالے سے ایک بڑی کتاب (نسخہ کبیرہ) روایت کی ہے[3] ابن سیرین کہتے ہیں کہ سمرہ نے اپنے مطالعے کے لیے جو کتاب مرتب کی تھی، اس میں علم کثیر تھا۔

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت نے خاص خاص لوگوں کے لیے کتابت حدیث کی ممانعت کر دی تھی اور جب ان لوگوں نے دوبارہ اجازت چاہی تو بھی نہ ملی، رافع بن خدیج ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے آنحضرت سے استمزاج کیا تو ان کو اجازت دیدی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کرتے رہے۔ چنانچہ مروان کے زمانے میں جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مدینہ حرم ہے یا نہیں، تو انھوں نے خود اپنی کتاب کے حوالے سے مدینے کے حرم ہونے پر استدلال کیا اور کہا کہ تم چاہو تو میں اس کی عبارت پڑھ کر سنا دوں۔ یہ کتاب ایوم خولان پر لکھی گئی تھی[4]

متذکرہ بالا کتابوں میں غالباً سب سے اہم کتاب عبداللہ بن عمرو بن عاص کی صادقہ ہے، جس کی اہمیت شاید عہد رسالت میں بھی سب کو تسلیم تھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام بھی اس عہد کی یادگار ہے، کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جس وقت یہ لکھی جا رہی تھی تو اس کے مندرجات و مضامین سے خود عبداللہ کے دوست اور قرابت دار بھی ڈرتے تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ ایکبار قریش نے ان سے شکایت کی اور کہا کہ آنحضرت بہرحال بشر ہیں کبھی عام انسانوں کی طرح غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں[5]۔ اور کبھی عالم رضا میں، اور تم سب کچھ لکھ لیتے اس پر عبداللہ نے آنحضرت سے استمزاج کیا۔ اور آپ کی اجازت سے پھر لکھنے لگے۔ عبداللہ کا یہ استمزاج اور پھر آنحضرت کی اجازت کے متعلق بکثرت روایتیں موجود ہیں۔

اور بقول الفریڈ گیوم۔ کم سے کم تیس مختلف طرق سے یہ روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جن میں بہت معمولی لفظی اختلاف ہیں[6]۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صادقہ کا وجود فرضی نہیں اور اس کی تصنیف خاص عہد رسالت میں ہوئی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ تابعین میں سے اکثر علما نے اس کتاب کو بچشم خود دیکھا اور استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ مجاہد کو بھی یہ سعادت حاصل تھی[7] یہ صحیفہ مدتوں ان کے خاندان میں محفوظ رہا اور عبداللہ کے پوتے عمر بن شعیب جب اپنے دادا سے روایت کرتے تو بطور سند کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی[8]۔ قیاس چاہتا ہے کہ ان کی روایات کا بڑا حصہ خود اسی کتاب سے ماخوذ ہے[9]۔

---

[1] شرح معانی الآثار للطحاوی ۲/۳۸۴ [2] تہذیب التہذیب ۱/۲۱۶ [3] جامع بیان العلم ۱/۳۷ [4] تہذیب التہذیب ۴/۳۹

[5] مسند ۴/۱۴۱ [6] عن عبداللہ بن عمرو قال قالت لی قریش تکتب عن رسول اللہ وانما رسول اللہ بشر یغضب کما یغضب البشر فامسکت فاتیت رسول اللہ ..... [7] مستدرک ۱/۱۰۴ جامع بیان العلم ۱/۳۶

[8] [9] تذکرہ

آخر میں انس بن مالک کی قلمی کاوشوں کا ذکر بھی ضروری ہے، اس لیے کہ انھوں نے بھی آنحضرت کے حالات بکثرت جمع کیے تھے ایک روایت مستدرک حاکم میں معبد بن ہلال سے اس طرح منقول ہے کہ جب ہم انس سے زیادہ سوالات کرنے لگتے، تو وہ ایک محال نکال لاتے اور کہتے کہ یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے خاص رسول اللہ سے سنی تھیں، اور ان کو لکھ لیا تھا، اور اس نوشتے کو میں نبی علیہ السلام کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ گویا اس تالیف کو آنحضرت کا شرف قبول بھی حاصل تھا۔

انس اگرچہ اپنی اولاد کو بھی ترغیب کتابت دیتے،[2] مگر ان کی روایات بیشتر مشہور تابعی عاصم بن عمرو بن قتادہ سے مروی ہیں جن کا شمار سیرۃ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ سیرۃ کی کتابوں میں ان سے کثیر روایتیں ملتی ہیں کہ اگر ان کو علیحدہ کر دیا جائے تو واقعات سیرۃ بالکل تشنہ رہ جائیں گے۔ گمان غالب ہے کہ انس کی تصنیف عاصم کے ہمیشہ پیش نظر رہتی۔ عاصم کے علاوہ دوسرے تابعی بھی ان سے تحصیل علم کرتے چنانچہ آبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ انس کے پاس بیٹھے الواح پر لکھا کرتے۔

مندرجہ بالا مثالوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عہد رسالت میں بہت سے صحابہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق آنحضرت کے حالات، اوامر، نواہی، قانونی نکات اور واقعات لکھ لیا کرتے تھے اور ان میں سے اکثر کی یادداشتیں اور کتابیں عہد تابعین تک محفوظ رہیں۔ پہلی صدی کے آخر میں جب علم حدیث و سیرۃ کی عمارت نئے انداز سے تعمیر ہونا شروع ہوئی تو اس کے آب و گل میں یہی قدیم لٹریچر استعمال کیا گیا یا بالفاظ دیگر اس لٹریچر نے نیا جنم پاکر پیغمبر اسلام کی سیرۃ اور قانون اسلام کی شکل اختیار کر لی۔ تاہم یہ دعویٰ کسی عنوان نہیں کیا جا سکتا کہ عہد رسالت کے یہ مکتوبات بہ تمام و کمال علمائے اسلام کو مل گئے تھے، اور ان کا کوئی حصہ زمانے کی دستبرد کا شکار ہو کر ضایع نہیں ہوا مجھے تسلیم ہے کہ دور آخر کے صحابہ اور تابعین نے اس قیمتی لٹریچر کو محفوظ کرنے کی بھرپور کوششیں کیں، اور طرح طرح سے اسے زندہ رکھنے کے اقدامات کیے۔ لیکن مختلف تاریخی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ایک حصہ پھر بھی ضایع ہو گیا۔

عہد رسالت کے فوراً بعد جب مصر، شام، اور عراق فتح ہوئے تو اندرون عرب کے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں خاندان ترک سکونت کر کے وہاں آباد ہو گئے۔ ان میں مدینے کے گھرانے بھی تھے اور مکے کے بھی مہاجر بھی تھے اور انصار بھی، قدرتی طور پر یہ اپنے گھروں کی تمام ضروری اشیاء ساتھ لے گئے ہوں گے، کتابیں بھی۔ قرآن بھی، سامان کتابت بھی، اور یادداشتیں بھی۔ خاندانی سربراہ کے مرنے کی صورت میں، اور چیزیں تلف ہوں یا نہ ہوں، کتابیں ضرور ضایع ہو جاتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ عمر بھر کی کمائی دوسروں کے ہاتھ لگ جاتی ہے جنھیں ان کے مصنف کا نام بھی نہیں معلوم ہوتا؟

تاریخ میں ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اسی قسم کی لاوارث کتابوں کے متعلق ہیں، میں یہاں دو کتابوں کو بطور مثال پیش کرتا ہوں ان میں سے ایک کتاب عراق میں مشہور تابعی حسن بصریؒ کو ملی تھی، جس سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ محدثین جانتے ہیں کہ حسن کی اکثر روایتیں مرسل اور بے سند ہیں کسی نے ان سے سوال کیا کہ یہ حدیثیں آپ کس طرح بیان کرتے ہیں؟ (اور ان کا اصل ماخذ کیا ہے؟) تو حسن نے جواب دیا کہ ہمیں ایک کتاب مل گئی ہے۔[3]

یہ صحیفہ کس کا لکھا ہوا تھا، کسی مہاجر کی تالیف تھا، یا انصاری کی؟ حسنؒ کے پاس کس طرح پہنچا؟ کس کس کے قبضے میں رہا، اوراق تاریخ میں ان باتوں کا کوئی جواب نہیں، علمائے متاخرین نے ان کی روایات کی اندرونی شہادتوں سے کچھ نتیجے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔[4]

---

[1] .....عن معبد بن هلال قال كنا اذا اكثرنا على انس بن مالك رضؓ اخرج علينا محالا عنده فقال هذه سمعتها وقال النبيؐ فكتبها وعرضها عليه (مستدرک ۳/۵۷۴ [2] دارمی ۱/۶۸

[3] قال حدثنا سوار بن عبد الوارث عن اخيه يسار، قال قيل للحسن يا ابا سعيد عمن هذه الاحاديث النبي تحدثنا صحيفة وجدناها، كفايه ۳۵۴/ [4] ترمذی کتاب العلل)

حسن بصریؒ سے سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں منقول ہیں جن کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس صحیفے سے ماخوذ نہیں ہیں۔

دوسری کتاب تقریباً اسی عہد میں ایک مصری عالم یزید بن ابی حبیب کو ملی تھی جس کا تعلق خاص طور پر تاریخ یا یوں کہیے کہ سیرۃ سے تھا آنحضرتؐ نے ۶ھ میں کچھ سفیر بیرونی ممالک کو روانہ کیے تھے اور ان کو خطوط دیکر کچھ خاص خاص ہدایتیں فرمائی تھیں، اس کتاب میں سفیروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ یہ ہدایتیں بھی تفصیلی طور پر درج تھیں۔

امام زہری کے زمانے میں جب تالیف سیرت کا کام زور شور سے ہو رہا تھا اور تحقیق حالات کے سلسلے میں حکومت وقت بھی ہاتھ بٹا رہی تھی تو اس قسم کے مخطوطات کا واحد مرجع صرف زہری کی ذات ہو سکتی تھی، چنانچہ یہ کتاب دمشق بھیجی گئی اور اس تزک کے ساتھ کہ ثقات شہر کا ایک وفد بھی ساتھ تھا۔[1]

ظاہر ہے کہ یہ کتاب آنحضرت کے کسی قریبی رفیق کار کے قلم سے نکلی ہوگی، جو واقعات کو بغائر نظر مطالعہ کر رہا تھا لیکن یہ کون تھا؟ کس کے ہاتھ سے یہ تحریر نکلی تھی؟ کچھ نہیں معلوم، حتیٰ کہ اس کے مکتشف یعنی یزید بن ابی حبیب المصری بھی یہ نہ بتا سکے کہ ان کے قیاس میں یہ کس کی تالیف تھی؟

اس قسم کی معلوم نہیں کتنی اور تالیفیں ہمارے ابتدائی سیرت نگاروں کے ہاتھ آئیں، اور کتنی ضایع ہو گئیں۔ کتنی کتابوں سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور کتنی زمانے کے گرداب میں بہہ گئیں؟ بہرصورت ان دونوں شہادتوں سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ خاص صحابہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دفاتر مصر شام اور عراق کے گلی کوچوں اور گھروں میں مدتوں گردش کرتے رہے، اور کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ ان کا لکھنے والا کون تھا۔

میری رائے میں کتب سیرت کی بے شمار ایسی روایتیں جنھیں قدیم سیرت نگاروں نے بالکل بے سند بیان کیا ہے سب نہیں تو ایک قابل لحاظ حد تک انھیں گمنام مصنفین کی رہین منت ہیں۔

اور ان کے بے سند ہونے کی بنیادی وجہ غالباً ایک یہ بھی ہے کہ ابتدائی سیرت نگاروں کو ان کے اصل مصنفین کے نام نہیں مل سکے تھے، روایتی اسناد کا تذکرہ آ گیا ہے تو یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ طریقہ تابعین اور تبع تابعین کا ایجاد ہے صحابہ کے عہد میں اس کا رواج بہت کم بلکہ شاذ و نادر نظر آتا ہے۔ چنانچہ کتب حدیث و سیرت میں، نو عمر یا جدید الاسلام صحابہ سے بے شمار ایسے واقعات کی روایتیں موجود ہیں جن میں یہ لوگ خود شریک تھے۔ اور محض سن کر یا کسی کتاب میں پڑھ کر انھوں نے ان واقعات کو بلا کسی ادنیٰ سند کے بیان کیا ہے۔

تابعین کے عہد میں بھی روایتی سند پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ یہ روایت کسی قابل اعتماد کتاب سے ماخوذ ہوں۔ چنانچہ اکثر تابعین کی بہت سی روایتیں بے سند ملتی ہیں، مثلاً عروہ بن زبیر، زہری۔ قتادہ وغیرہ نے سیرت کے سلسلے میں جو روایتیں بیان کی ہیں اکثر بے سند ہیں، کفایہ میں حیوۃ بن شریح سے ایک روایت اس طرح منقول ہے کہ انھیں یزید بن ابی حبیب نے بتایا کہ فلاں شخص میرے پاس ایک کتاب چھوڑ گیا، یا ایسا ہی کوئی کلمہ کہا، تو میں نے اس میں اعرج کی روایتیں پائیں (حیوۃ کہتے ہیں کہ یزید نے) اس کتاب میں سے بہت سی باتیں ہمارے روبرو بیان کیں، مگر کسی کے ساتھ نہ "اخبرنا" کہا نہ حدثنا" [2] (باقی آئندہ)

---

[1] ..... حدثنی ابن اسحٰق عن یزید بن ابی حبیب المصری انہ وجد کتابا لتمیم من بعث رسول اللہ الی ملوک الخائبین وما قال لاصحابہ حین بعثھم فبعث بہ الی ابن شھاب الزھری مع ثقۃ من اھل بلدہ فعرفہ..... طبری تاریخ السنۃ السادسۃ ۱/۵۸

[2] ..... قال حدثنا حیوۃ بن شریح عن یزید بن ابی حبیب، قال اودعنی فلاں الکتاب لا یقول اخبرنا ولا حدثنا..... فوجدت فیہ عن الاعرج وقال وکان یحدثنا بہ..... کفایہ ۳۱/

چھیڑ غالب سے چلی جائے
غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بے حد دلچسپ انداز سے پیش کرنیوالی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے۔ قیمت: ۵ روپے
نگار بک ایجنسی رام پور

بہار عجم کے مخطوطے پر خانِ آرزو کے حواشی

راز یزدانی (مرحوم)

تصنیف و تالیف کی دنیا بظاہر اہل قلم اور ارباب علم کی دنیا ہے۔ اگر اس دنیائے شرفائے علم و ادب میں بھی چور بازاری اور بلیک میلنگ ہونے لگے تو اخلاق و تہذیب علم و فن کا "خدا حافظ و ناصر" لیکن بعض اوقات اس دنیا میں بھی ایسی دھاندلی ہو جاتی ہے کہ توبہ۔ مجھے تو خیر کئی اردو زبان کے باباؤں اور ناخداؤں کے بہت سے ایسے واقعات معلوم ہیں کہ جن سے پردہ اٹھے تو ڈوب کار لیے بغیر پرایا مال ہضم کر جانے والوں کے مکروہات کا پس منظر عوام کے سامنے آجائے لیکن جب تک چھپی باتیں چھپی رہیں تو ان سے چھیڑے بغیر گزر جانا ہی بہتر ہے۔

ایسے ہی بدقسمت مولفوں میں ایک نام ٹیک چند بہار کا ہے۔ بہار عجم کا مشہور مولف ٹیک چند بہار جس کی کتاب کو سب جانتے ہیں لیکن لائبریریوں کے علاوہ وہ ہمارے سامنے آئی تو مصطلحات بہار عجم کے نام سے رائے اندرمن کی تالیف کا روپ بدل کر۔ اندرمن بہار عجم کے مصنف کا شاگرد عزیز تھا۔ بہار عجم میں مولف نے سات بار ترمیم و تنسیخ کی اور ہر بار اس کا نیا مسودہ تیار کیا۔ ساتویں بار ترمیم و تنسیخ کے بعد مولف کا ارادہ اس ساتویں مسودے کو بھی صاف کرنے کا تھا لیکن ضعف پیری نے اس کے ارادے کا ساتھ نہیں دیا اور بستر مرگ پر وہ اپنا یہ "مسودہ ہفتمین" اور دوسری نادر کتابیں جن میں نوادر المصادر بھی شامل تھی اپنے شاگرد عزیز اندرمن کے سپرد کر گیا۔ لیکن اس شاگرد عزیز اور تلمیذ رشید نے استاد کے مال پر جس طرح ہاتھ صاف کیا اس کے نتیجے میں اب بہار عجم کا مطبوعہ نسخہ کہیں نہیں پایا جاتا لیکن "مصطلحات بہار عجم" ہر جگہ ملتی ہے۔

"مصطلحات بہار عجم" پہلی بار ۱۸۵۳ء میں دہلی سے محب العلوم پریس نے شائع کی لیکن اسی میں اندرمن پر وہ مثل صادق آئی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ ہر سیر کو سوا سیر اور ہر فرعون کو موسیٰ اس دنیا میں خود بخود مل جاتا ہے "مصطلحات بہار عجم" پر خاتمۃ الطبع لکھا منشی دھرم چند نے اور اندرمن کی پول کھول کے رکھ دی۔ کہتے ہیں:

"بندہ درگاہ خداوند دھرم چند ابن منشی دیپ چند خلف لالہ برج لال مرحوم (دیوان منڈسور۔ مضاف صوبہ مالوہ) قوم کھتری ساکن شہر کہنہ حضرت دہلی و مقیم حال شہر معینت بہر دار الحکومت شاہ جہان آباد حرسہا اللہ عن الافات والفساد در باب شرح حال نسخہ متبرکہ بہار عجم۔ بحسب فرمودہ جناب جد معظم صاف صاف میگوید کہ منشی ٹیک چند المتخلص بہ بہار مولف نسخہ مذکور قوم کھتری ساکن نہر نواب سعادت خاں مغفور واقع شاہ جہان آباد بہار عجم تالیف خود را بعد حک و اصلاح ہفت بار از قلم ندرت رقم خود بخط نستعلیق از سواد بر بیاض آورد میخواست کہ بار ہشتم ہم صاف نماید مگر چون در قوائش ضعف پیری راہ یافت ازاں جہت غنچہ مرادش ناشگفتہ ماند۔ رائے اندرمن قوم بیس باشندہ حصار صاحب دستور الحساب تلمیذ خاص مصنف بود و در وقت آخرین نسخہ مذکور یعنی مسودہ ہفتمین بہار عجم و نسخہ نوادر المصادر و تخطی و تالیفی او معہ چند کتب دیگر بطور تبرک و یادگار از استاد خود حاصل نمود۔ چون نسخہ مرحوم بالکل مسودہ لایق صاف کردن بود مولف دستور الحساب بطور خود انتخاب مسطور گردانیدہ و دیباچہ خاتمہ آں از نام خود بران کتاب فیض انتساب برنگاشت و خنجر گمنامی و بے الفانی برگردن شہرت و ناموری استاد خود راند۔ چنانچہ بعد انتخاب نسخہ مذکور در جہان مشہور گردید ازاں جا کہ دیوان پرجلال صاحب بیکنٹھ باشی حد بزرگوار این ہمہ دان میدان جہل و نادانی در علم حساب و سیاق شاگرد رشید رائے اندرمن بود جناب ممدوح

اصل نسخہ مرحوم را بہ نسبت در رابطہ شاگردی و حق عوض خدمت از استاد خود یافتند و سہ بار بلا امداد و اعانت دیگر صرف بذات خود در شہر دہلی (و در مندسور) در عین کم فرصتی بسیار بکار سرکار مقابلہ و تصحیح نسخہ منتخب رائے مفخم علیہ باصل مسودہ ہفتمین منشی ٹیک چند بہار نمودہ۔ عبارت معانی و لغات و اصطلاح و ابیات و نقرات استاد فرد گزاشت را۔ داخل نسخہ منقول خود نمودند حرف حرف موافق و مطابق بلکہ بہتر از نسخہ دستخطی خاص صاحب بہار عجم گردانیدہ جانِ تازہ در قالب کتاب اندا ختند و نام مرد بہار را بعین سعی خود زندہ جاوید ساختند در شہر و دیار و قصبہ و امصار نسخہ اندرمن پیرایہ شہرت پوشیدہ بود و ایں نسخہ کہ طابق النعل[1] بالنعل نسخہ ہفتمین اوست بجز ایں خاندانِ عالیشان جائے دیگر نبود ..... الخ ..... کاتب الحروف متہام بندہ دولت رام کائتھ"

گویا یہ نسخہ مصطلحات بہار عجم "حرف بحرف نقل ہے مسودۂ ہفتمین صاحب بہار عجم کی اور اندرمن نے اپنے استاد کی گردن پر جو خنجر بے امانی" چلایا تھا اس کی ڈھال خود اندرمن کا ایک شاگرد رشید بن گیا اسے کہتے ہیں جیسے کو تیسا۔

مصطلحات بہار عجم کا یہ نسخہ جو نسخۂ ہشتمین بہار عجم کہا جاسکتا ہے دو جلدوں میں شایع ہوا ہے اس طرح کہ پہلی جلد میں ۸۱۷ صفحات اور حرف "ر" پر ختم ہوئی ہے اور دوسری جلد میں صفحات ہیں اور حرف "ی" پر ختم ہوئی ہے تاریخ طباعت ۲۷ جنوری ۱۸۵۲ء مطابق ۱۸ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ ہے ـــــ کتاب پر مصنف اصلی نے جو دیباچہ لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ختم تحریر پر مصنف کی عمر ۵۲ سال کی تھی اور بیس سال کی محنت سے اس نے ترمیم و تنسیخ کے بعد کتاب کا ساتواں مسودہ تیار کیا تھا اس کتاب کے اتمام کی تاریخ اس نے "یادگار فقیر حقیر بہار" سے نکالی ہے جس کے اعداد ۱۱۵۲ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر ریو اور ڈاکٹر ایتھے کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جسکی نشاندہی عبدالمقتدر صاحب کیٹلاگر کتابخانہ بانکی پور نے بھی کی ہے۔

کتاب خانہ برٹش میوزیم اور باڈلین لائبریری میں بہار عجم کے جو مخطوطے پائے جاتے ہیں ان میں "یادگار فقیر حقیر بہار مادہ سال تاریخ اتمام است" کے فقرے میں لفظ "مادہ" پر غلطی سے دو لفظوں کا اضافہ ہوگیا ہے اور کیٹلاگر صاحبان نے اس عبارت کو اس طرح پڑھا ہے کہ یادگار فقیر حقیر بہار نادہ سال۔ تاریخ اتمام است۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یادگار فقیر حقیر بہار کے اعداد میں دس سال اور بڑھائے جائیں تو اصل کتاب کا صحیح سن تالیف حاصل ہو یعنی ۱۱۵۲ کی جگہ نادہ سال کی شرط پوری کر کے ۱۱۶۲ھ کو کتاب کی تالیف کے اتمام کی سال سمجھنا چاہیے۔ لیکن آج چوں کہ مصطلحات بہار عجم" شایع ہو چکی ہے اور دیباچہ میں نادہ سال نہیں بلکہ "یادگار فقیر حقیر بہار مادہ سال تاریخ اتمام است" کے الفاظ واضح طور پر موجود ہیں اس لیے اب اس مغالطے کا کوئی امکان نہیں میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ مادہ پر تشدید کی موجودگی کو ان کیٹلاگرس نے حرف تا کے نقطے سمجھ لیا ہوگا اور "مادہ تاریخ سال اتمام است" کی عبارت "نادہ تاریخ سال اتمام است" پڑھی گئی ہوگی۔

ٹیک چند بہار کا ذکر اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملتا۔ ہونے کو یہ نام میر کے نکات الشعرا مرتبہ ۱۱۶۵ھ۔ سید فتح علی الرضوی المعروف بہ گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویان مرتبہ ۱۱۶۶ھ قائم کے تذکرہ مخزن نکات مرتبہ ۱۱۶۸ھ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ چمنستان شعراء مرتبہ ۱۱۸۵ھ گلزار ابراہیم مرتبہ ۱۱۹۸ھ اور مصحفی کے تذکرہ ہندی گویان مرتبہ ۱۲۰۱-۹ھ میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان تذکروں میں نکات الشعراء تذکرہ ریختہ گویان اور مخزن نکات سے علی العموم اور گردیزی سے علی الخصوص بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

میر اور قائم تو خیر نہ پورے واقعات بیان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں نہ اپنی حسب مطلب باتوں کے علاوہ کسی کے متعلق ضروری تفصیل میں جاتے ہیں غیر ضروری کا تو ذکر ہی کیا اور میر نے تو بعض اوقات اپنے جذبات کی رو میں غیر ضروری اور بے جا تفصیل سے داستان سرائی اور یاوہ گوئی تک سے دریغ نہیں کیا واضح رہے کہ یاوہ گوئی سے راقم الحروف کا مقصد یہ ہے کہ ایک تذکرہ کی دیانت تحریر کے لیے جو حدود مقرر کیے جاسکتے ہیں ان کی خلاف ورزی کی جائے لیکن گردیزی کے تذکرے سے شکایت کی وجہ بڑی معقول ہے کیونکہ وہ اپنے تذکرے کے دیباچہ میں اس تذکرہ کا سبب تحریر ہی یہ بیان کرتا ہے کہ حالات شعراء میں کمی اور خامی دیکھ کر اسے قلم اٹھانے کی ہمت ہوئی۔ یہ دیکھ کر توقع بندھتی ہے کہ گردیزی کے تذکرے میں ضروری معلومات کا اضافہ ملے گا۔ مگر ہماری مایوسی کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ گردیزی

---

[1] طابق النعل بالنعل۔ (جس طرح ایک جوتی دوسری [illegible] پر رکھی جائے۔ یعنی نقل مطابق اصل۔ (راز)

نے بھی اس عہد کی مروجہ ڈگر سے ہٹ کر کسی شاعر کے متعلق کہیں ایسی معلومات فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی جو اس کے لیے آسان تھیں اور آنے والوں کے لیے بے حد قیمتی۔

بہار کے سلسلے میں ہی اس کی تفصیل سن لیجیے۔ نکات الشعرا صفحہ ۱۳۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "با فقیر ہم آشنا است" لیکن اس "ہم آشنا است" کا مرتبہ عالیہ عطا کرنے کے باوجود میر نے نہ اپنے اس "ہم آشنا" کی عمر لکھی نہ اس کا سن پیدائش نہ حسب و نسب نہ وطن۔ گویا ساتھ کھا کے ذات بوجھنے کی کیا ضرورت تھی بس صیغۂ "آشنائی" کا اظہار کافی تھا۔ گردیزی کا معاملہ اس سے زیادہ گرفت کے لائق ہے کیوں کہ وہ لکھتا ہے (صفحہ ۲۱) ٹیک چند بہار بفقیر اخلاص می دارد و اکثر ہا ملاقات می پردازد" خلوص ملاقات کا یہ تذکرہ گردیزی کو بہار کے کمالات کے ذکر پر مجبور کر دیتا ہے یہاں تک کہ " در تحقیق لغت ہائے فارسی و موقع استعمال آن کتاب ضخیم مسمی بہ "بہار عجم" تالیف نمود اور پھر کہتا ہے کہ ایسا باکمال شخص بہت کم نظر سے گزرا ہے "بایں کمالکم بنظر در آمد" لیکن اس کے بعد وہ اپنے ملاقاتی اور یار باخلاص" کے متعلق سال پیدائش۔ موجودہ عمر۔ اور حسب و نسب یہ تمام باتیں گول کر جاتا ہے جیسے ان باتوں کا بتانا اپنے یار باخلاص کی " بارگاہ مودت پناہ" میں جرم کرنے کے مترادف ہو معلوم ہوتا ہے کہ قائم کے تذکرے مخزن نکات کی تحریر یا تکمیل تک یعنی ۱۱۶۸ھ سے پہلے بہار کا انتقال ہو چکا تھا۔ کیوں کہ مخزن نکات صفحہ ۲۵ پر اس نے لکھا ہے کہ " او زرگر بود" لیکن صحیح تاریخ انتقال قائم نے لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی حالانکہ صحیح تاریخ کا معلوم کرنا اس کے لیے دشوار نہ تھا کیونکہ ۱۱۶۶ھ تک تو بہار زندہ ہی تھے ان ہی درمیانی دو سالوں کے اندر اندر ان کا انتقال ہوا ہوگا اور دو سال کے اندر اندر کی بات صحیح طور پر معلوم کر لینا کیا دشوار ہے۔ لیکن کسی "زرگر" کے لیے اتنی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت جبکہ وہ اچھے اچھے سیر زادوں کے لیے بھی اتنی زحمت نہیں اٹھاتا۔ اور پھر لطف یہ کہ "یہ زرگر پسر" کی بات بھی سنی سنائی اور کسی یار دوست کی ہوائی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ بعد کی اطلاع ہے "گلزار ابراہیم" اور تواتر کے ساتھ کہ ٹیک چند بہار کھتری تھے۔

غرض بہار کے خود نوشت حالات (جس قدر بھی ممکن ہیں) کتاب کے خاتمۃ الطبع۔ اور دیگر تذکروں سے آج جو اندازہ کیا جا سکتا ہے وہ ان حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ کہ بہار تھے تو ضرور۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں اور کئی کتابیں ان کی پائی جاتی ہیں اس لیے شکسپیئر کی طرح بہار کوئی ایسی ہستی موہوم نہیں ہو سکتے جس کے ہونے میں شبہ کیا جا سکے ذات کے لحاظ سے وہ کھتری تھے اور دہلی مرحوم کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ بہار عجم پر انھوں نے بیس سال صرف کیے۔ سات بار اس کتاب کے مسودہ پر کاٹ چھانٹ اور قطع و برید کرتے رہے جسے مصنفین اور مولفین کی اصطلاح میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کہتے ہیں۔ آٹھویں بار وہ ضعف پیری کی بنا پر مسودہ کتاب کو صاف نہ کر سکے اور مسودہ ہفتمین اور دوسری دستخطی تالیفات کو بطور یادگار کے اپنے شاگرد رشید من کے سپرد کر گئے۔ اور یہی مسودہ ہفتمین آج۔ مصطلحات بہار عجم" کے نام سے "ہو بہو" ہمارے سامنے موجود ہے۔ پہلا نوادر المصادر ۱۲۷۲ھ میں دہلی سے اور جواہر الحروف ۱۲۲۷ھ میں کانپور سے شایع ہو چکی ہیں۔ اسپرنگر نے گلزار ابراہیم کے حوالے سے ان کے سفر ایران کے بارے میں بھی لکھا ہے ممکن ہے کہ بہار نے ایران کا یہ سفر بہار عجم میں ہی ترمیم اور اضافوں کی غرض سے کیا ہو اگر اس حقیقت سے پردہ اٹھ جاتا تو کتاب اور وقیع ہو جاتی فی الحال تو صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بہار عجم کے ماخذوں میں حزیں کا کلام۔ سراج اللغت۔ ملحقات برہان قاطع اور ابوالحسن قزاینی کی شرح قصائد انوری ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارا غریب شہر" اپنے "سنہائے گفتنی" میں بہار کی فارسی دانی کا معترف نہیں کیونکہ جو شخص حزیں کا معترف ہو اور برہان قاطع پر قاطع برہان" لکھے وہ "خان آرزو اور بہار عجم" کو کب خاطر میں لائے گا۔ چنانچہ "جہان غالب" (معاصر حصہ نمبر ۱) میں قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے:۔

"آرزو ۱۰۹۹ھ / ۱۱۶۶ھ خان آرزو ہندوستان کے مشہور فارسی دان اور شاعر تھے۔ حزیں سے اگر نہیں بنی لیکن امید و والہ وغیرہ ایرانی جوان کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے۔ ان کے قدر شناس تھے۔ غالب نے ایک خط میں جہاں ہندوستانی فارسی گویوں کی نسبت کسی قدر تفصیل کے ساتھ رائے ظاہر کی ہے حزیں اور فغانی کے بعد لکھتے ہیں "یہ سپاہی غالب (کذا) آرزو فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آگئے ناصر علی اور بیدل اور نظیری ان کی فارسی کیا متنت اور رکین دانش اور قتیل۔ یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے .... دانستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سوجگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے

(عود ہندی صفحہ ۴۴) " فارستہ نے اپنی مصطلحات میں (اور اس کا ثبوت موجود نہیں کہ وارستہ کی کوئی اور کتاب غالب کی نظر سے گزری تھی) آرزو کو کہیں سراج المحققین صفحہ ۲۹۵ اور کہیں سراج المدققین صفحہ ۲۲۲ لکھا ہے احسان کے اشعار کی سند دینے میں تامل نہیں کیا صفحات ۲۵ و ۶۵ وغیرہ آرزو پر وارستہ کے جو اعتراضات ہیں ان کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں صفحات ۲۱ و ۹۵ و ۲۲۵ و ۲۹۵ و ۳۹۷ — آرزو نے ہزاروں الفاظ سے بحث کی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وارستہ کے کل اعتراض بجا ہیں جب بھی ان کا مرتبہ کم نہیں ہوتا ہاں اغلاط بہت زیادہ نکلیں تو اور بات ہے غالب نے ایک خط میں ایک محاورے کی بحث میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب تک کلام اہل زبان میں نہ دیکھ لیں " جائز نہ جانئے مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال (نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا) عود ہندی صفحہ ۱۳۲ — قاطع برہان میں غالب نے ایک حکایت بھی لکھی ہے کہ برسات کی اندھیری رات تھی۔ مینہ برس رہا تھا ہوا تیز چل رہی تھی کہ آرزو نے ایک مصرعہ کہا ئے کشاں مژدہ کہ ابر دیسا رکد (حقا کہ اگر گویند کہ ایں زمزمہ از قنافیست یا از نظیری کسے است کہ باور نہ کند ؟) اور پیش مصرعہ یہ سوجھا تند و پر شور و سیہ مست زکہسار آمد اسی وقت مرزا مظہر کے پاس گئے مطلع سنایا اور داد لی۔ مطلع شہر میں مشہور ہوا اور ایک سوداگر نے جو شیراز سے تازہ تازہ آیا تھا اسے سنا۔ آرزو ایک مطلع سنانے لگے پہلا مصرعہ ان کی زبان سے نکلا تھا کہ سوداگر خوب ہنسا اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ دوسرے مصرعہ میں کیا کہیں گے۔ آرزو کو ناگوار ہوا بولے بتلیئے میں کیا کہوں گا جواب دیا " خواہی گفت کہ خرمن آمد " آرزو نے زہر خند کیا اور اپنا مصرعہ پڑھا۔ سوداگر نے دوسرے مصرعہ کی تعریف کی اور پہلے کے بارے میں کہا کہ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا — " قطرہ افشاں لبوے شہر ز کہسار آمد۔ غالب اپنی رائے دیتے ہیں۔ باآنکہ میرزائے شیرازی سخن را بود لطف طبع را میرم کہ تندی و پر سوزی و سیہ مستی کہ میان ابر و خرمن مشترک است نہ پسندید و مصرعے مذکور از مصرعۂ استاد و لغز تر دجوشتر و بدیہہ گفت " صاحب مؤید برہان کے اس خیال سے مجھے (قاضی صاحب کو) اتفاق ہے کہ آرزو کا مصرعہ بہ مراتب بہتر ہے اور اعتراض لغو انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ حکایت اختراعی ہے۔ غالب نے تیغ تیز میں اس کا جواب نہیں دیا قاطع برہان کے علاوہ یہ حکایت اور کہیں نہیں ملتی اور اس میں شک نہیں کہ بالکل بے بنیاد ہے۔ معاصر نمبر ا صفحہ ۵۲ و ۱۵۲)

حزیں کے ساتھ جو سلوک آرزو بہار و وارستہ نے کیا تھا غالب اس کے متعلق اپنی اسی کتاب میں رقمطراز ہیں حاشا کہ بعد از صائب و کلیم چوں حزیں دیگرے از خاک پاک ایران برخاستہ باشد می بایست مقدم اور اگرامی داشتن و سخنش بر ورق دل نگاشتن غواص تعلق پارسی از وے فرامی گرفتند و زنگار شک از آئینہ دانش بمقولۂ ارشاد دے می زدودند..... (معاصر نمبر ا صفحہ ۱۵۲)

ظاہر ہے کہ ان خیالات کے ہوتے ہوئے اور حزیں کو اتنا بلند مرتبہ سمجھتے ہوئے غالب کے خیالات آرزو کے متعلق کیا ہوں گے بہرحال وہ بہار کی لغت دانی میں شک رکھتے ہیں اور اس شک کی تفصیل تو آگے آئے گی لیکن اس موقع پر ہم کو خود بہار سے بھی ایک شکایت ہے اور وہ شکایت پرانے دیباچہ لکھنے والوں میں عام ہے اس لئے نہ صرف بہار سے بلکہ اس عہد کے تمام مصنفوں سے یہ شکایت ہو سکتی ہے شکایت یہ ہے کہ دیباچہ میں جہاں تک حمد و نعت کا تعلق رہتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کا دریائے زخار ہے جو ایک بحر ناپیدا کنار کی طرح مصنف یا مؤلف کے قلم سے اُمڈ اچلا آتا ہے لیکن جہاں سے حمد و نعت ختم ہوتی ہے اور " می گوید فقیر حقیر بیمج عمران کج مج بیاں محرر ایں داستاں " کی منزل شروع ہوتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے یہاں تک مولف یا مصنف نے جس قلم سے لکھا تھا اس کا قلمدان بھولے سے کھلے سامان کے نیچے کھلا ہوا رکھا رہ گیا اور رات بھر قلمدان میں رکھے ہوئے قلموں پر اوس پڑتی رہی۔ نتیجہ ظاہر ہے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ مصنف مولف دوبارہ لکھنے بیٹھا تو قلمدان کے سب قلم " شبنم زدہ " ہو چکے تھے ان ٹھٹھرے ہوئے قلموں کے ہوش خود ہی بجا نہ تھے کوئی ڈھنگ کی بات مصنف یا مؤلف کے بارے میں کیا لکھتے۔ اظہار خاکساری اور ناظرین سے استدعائے عیب پوشی کے سوا ان قلموں سے اور لکھا بھی کیا بہار نے پھر بھی سبب تالیف لکھتے ہوئے اتنا بتا دیا کہ لوگ دوسروں کے نوشتوں کو دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ :-

"این ترکیب درست نیست و این عبارت خلاف محاورہ است و این لفظ بایں معنی مستعمل نشدہ"

گو اعلام کے یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات سن کر بہار کو ایک ایسی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا جو ان سب باتوں کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر سکے۔ لیکن بہار کون تھے۔ وہ کب پیدا ہوئے۔ ان کا مبلغ علم کیا تھا اور کب ان کا انتقال ہوا۔ آج ہم ان سوالوں کا جواب بیان کردہ حالات کی روشنی میں اپنے اندازوں سے ہی دے سکتے ہیں، سنیے:

۱۱۵۲ھ یعنی تکملہ بہار عجم کے وقت مولف کی عمر خود اس کے بیان کے مطابق ۵۳ سال کی تھی اس لیے یقین ہے کہ وہ ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور یہی خان آرزو کی پیدائش کا سال ہے۔ گو بہار اور وہ ایک ہی سال کی پیدائش ہیں۔ اس کے بعد میر اور گردیزی کی شہادت ہے کہ باقیر ہم آشنا است اور "اکثر با ملاقات می پژمرد" اس کے معنی ہیں کہ ۱۱۶۶ھ تک وہ زندہ تھے اس کے بعد قائم ۱۱۶۸ھ میں کہتا ہے کہ "در گور بود" اس کے یہ معنی ہیں کہ ۱۱۶۸ھ میں بہار کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگر اس انتقال کو دو چار مہینے گذرے ہوتے اور قائم کے مخزن نکات لکھتے وقت بات تازہ ہوتی تو وہ ضرور ظاہر کر دیتا۔ ان تمام اندازوں سے میرا قیاس ہے کہ ہم آسانی سے ۱۱۶۷ھ کو ان کے انتقال کے لیے موزوں سمجھ سکتے ہیں۔

یہ بات کہ اتنی ضخیم کتاب میں لغات کی تشریح اور ان کے بیان میں انھوں نے حتی الوسع عربی الفاظ سے گریز کی اس بات کی ضمانت ہے کہ ان میں کتب متداولہ اور علوم مروجہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ بہار کی کتابیں نوادر المصادر ۱۲۷۲ھ میں اور جواہر الحروف ۱۲۶۷ھ میں کان پور سے شائع ہو چکی ہیں مگر اب شاید ان کی موجودگی کا کھوج "بے ستوں" کو کاٹنے سے کم نہیں اسپرنگر نے یہ بھی لکھا ہے کہ بہار کا انتقال گلزار ابراہیم کی تالیف سے پہلے ہو چکا تھا اور گلزار کی تالیف ۱۱۹۸ھ کی بات ہے ظاہر ہے کہ ۱۱۹۸ھ اور ۱۱۶۷ھ میں ۳۱ برس کا فرق ہے۔

کتاب خانہ بانکی پور میں نوادر المصادر کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

کتاب خانہ رام پور میں بہار عجم کے مخطوطے کی دوسری جلد موجود ہے۔ مخطوطے کا جو نسخہ کتاب خانہ رام پور میں ہے اسے میں دوسری جلد اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ مطبوعہ جلدوں کی تقسیم اس مخطوطے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں سوائے اس کے کہ مخطوطے کے پہلے صفحہ پر "حرف ر" کے بھی دو چار لفظ آ گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیک چند بہار نے کتاب کو ضخیم دیکھ کر دو جلدوں میں تقسیم کیا تھا اور تقسیم یہی رکھی تھی کہ حرف "ر" تک پہلی جلد اس کے بعد دوسری جلد مگر اس تقسیم کی پابندی صحیح صحیح نہ ہو سکی اور مخطوطے کی دوسری جلد میں "حرف ر" کے بھی کئی لفظ آ گئے۔

میں سالج میں کسی جگہ لکھ آیا ہوں کہ غالب بہار سے آزردہ معلوم ہوتے ہیں یہ آزردگی درحقیقت ایک اصولی اختلاف سے پیدا ہوئی ہے جو غالب اور خان آرزو اور ان کے متبعین میں پایا جاتا ہے خان آرزو اور ان کے متبعین کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر وہ شخص جو فارسی کو جاننے کی حد تک جانتا ہے اس زبان پر اہل زبان کی طرح مساوی حق رکھتا ہے اور غالب کا عقیدہ یہ تھا کہ جو لفظ ایرانی فصحا کے یہاں جو معنے رکھتا ہے اس معنے کے علاوہ دوسرے معنی میں اسے لکھنا اور اس کے استعمال کی اجازت دینا غلط ہے۔ اس عقیدے کی غالب نے جس شد و مد سے پیروی کی ہے وہ برہان قاطع پر قاطع برہان لکھنے اور اس کے مضامین سے ظاہر ہے ہر چند غالب نے اپنے خطوط میں کھل کر تو بہار کا نام ایک جگہ کے علاوہ کہیں نہیں لیا۔ مگر صاحب غیاث اللغات نے وہ کھل کر بہت سے ہیں اور کئی جگہ (ملاحظہ ہو ادبی خطوط غالب) لیکن ٹیک چند بہار کا نام انھوں نے خلد آشیاں نواب کلب علی خاں خلف الرشید فردوس مکان نواب یوسف علی خاں کے نام ایک خط میں لیا ہے فرماتے ہیں:-

"میاں نجو جامع فرہنگ۔ جہانگیری۔ شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی علمائے عجم میں سے نہیں ہندآن کا مولد ماخذان کا اشعار قدما۔ ہادی ان کا قیاس۔ ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ۔ ہندی بھی اور ہندو بھی۔

فقیر اشعار قدما کا معتقد اُن لوگوں کے کلام کا عاشق مگر جو لغات ان کے کلام میں ان کے معنی تو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں، میں ان کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں۔" (مکاتیب غالب صفحہ ۶۱)

ظاہر ہے کہ آج کے علمائے لسانیات کے نزدیک یہ نظریہ تنگ دلانہ ہے بہرحال اس نظریہ کی بنا پر غالب ہمارے ٹیک چند سے ناراض نظر آتے ہیں۔

بہار کے مخطوطے پر میرے بزرگ محترم مولانا عرشی نے جو شناختی کارڈ لکھا ہے اس سے بھی اور اس مخطوطے پر جو حاشیے ہیں بیشتر ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حاشیے

خان آرزو کے تحریر کردہ ہیں۔ کیوں کہ ان میں کئی جگہ (جیسا آپ دیکھیں گے) حاشیہ فقیر آرزو ہی کو یہ سے شروع ہوتا ہے لیکن مصطلحات بہارِ عجم کے شناختی کارڈ پر محترم موصوف ہمیں ایک دوسری بات بتاتے ہیں:

"آغا محمد حسین صاحب کشمیری کے پاس بہارِ عجم کے اصل نسخے کی دوسری جلد محفوظ ہے، اس میں جابجا حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے بجز ایک دو کے سب کے سب انہیں اپنے مواقع پر نقل کر دیئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر خان آرزو کے نوٹ ہیں جو انھوں نے بہار کے مسودے پر لکھے تھے۔ آغا صاحب کے نسخے کے کاتب نے انھیں جوں کا توں نقل کر لیا ہے موجودہ نسخوں میں ان کے حواشی کے پیش نظر ترمیم و تغیر نظر آتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بہار نے خان آرزو کے اکثر اعتراضوں کو قبول کر لیا ہے۔"

(امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ یکم اگست ۱۹۴۵ء)

میرے سامنے اس وقت بہارِ عجم کے مخطوطے کی وہ جلد ہے جسے میں بوجوہ بالا دوسری جلد کہتا ہوں اور مصطلحات بہارِ عجم مطبوعہ کی دوسری جلد بھی۔ میں "حرف ز" سے ابتدا کر رہا ہوں۔ میں اس مخطوطے پر خان آرزو کے حواشی کا مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کر کے یہ بھی بتا جاؤں گا کہ بیک چند بہار نے کس کس اعتراض کو قبول کر کے متن میں داخل کر لیا ہے۔ یا در صورتِ قبول کیا تغیر و تبدل کیا۔ (باقی آئندہ)

رازیزدانی کا اچانک انتقال سے مضمون نامکمل رہ گیا۔

(۱) اس لیے کہ وہ ابھی اسی قدر لکھ پائے تھے۔

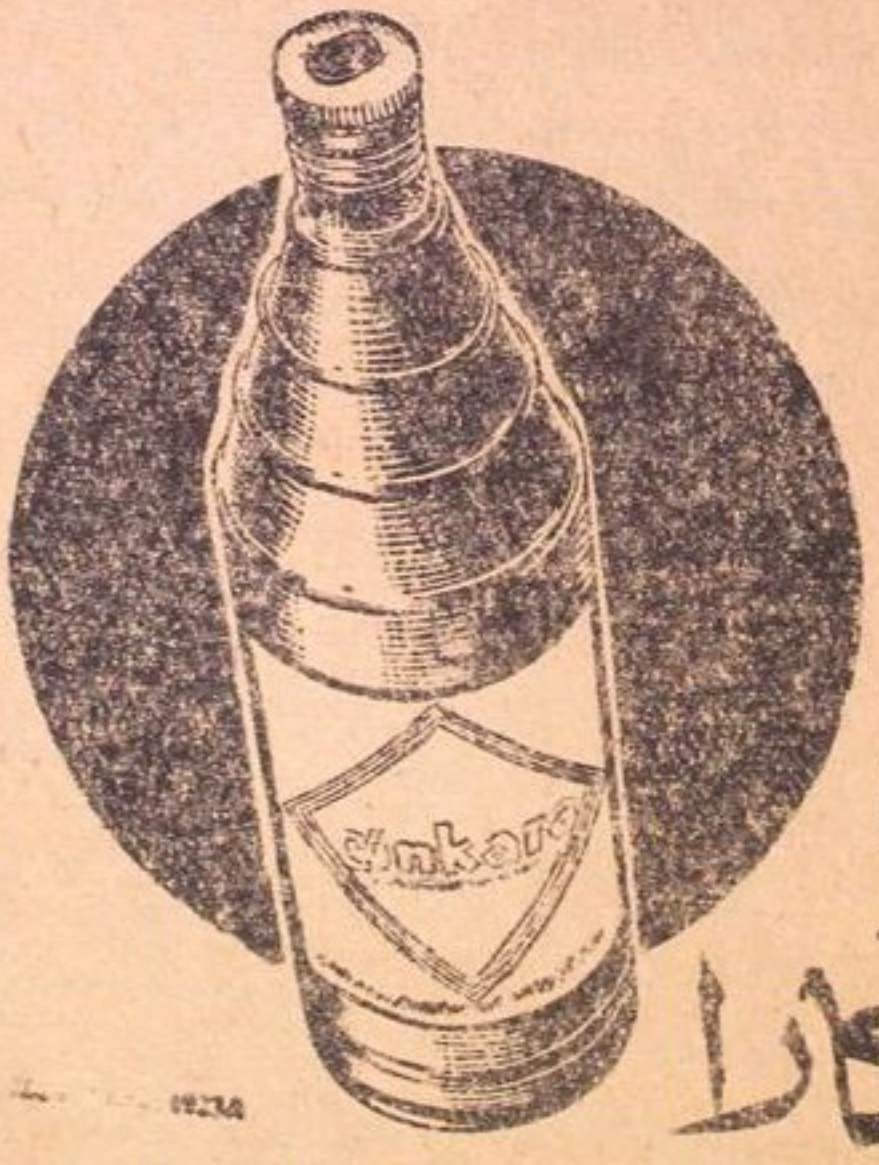

بچوں، بوڑھوں، جوانوں
سب کے لیے اور ہر عمر میں
کام آنے والا وٹامنوں سے
بھرپور جڑی بوٹیوں کا ٹانک،
کھوئی ہوئی توانائی کو بہت
جلد بحال کرتا ہے۔
ہر عمر اور ہر موسم میں سب کے لیے جنرل ٹانک

ہمدرد

دہلی - کانپور، پٹنہ

سنکارا

خُدا
ایک لسانی تحقیقی جائزہ

سیّد قدرت نقوی

کائنات کا نظام حرکت پر قایم ہے۔ اسی لیے ذرّہ ذرّہ محوِ گردش ہے۔ اسی گردش کے نتیجہ میں چیزیں عدم سے وجود میں آتی، اور وجود سے عدم کی راہ اختیا کرتی ہیں۔ وجود سے عدم تک کا فاصلہ طے کرنے میں یہ اشیاء عروج وزوال کے مراحل طے کرتی رہتی ہیں۔ ان میں عمل تہذیب وتزئین ہوتا رہتا ہے۔ عمل تقلیم سے تہذیب وارتقا اور عمل تنقیل سے وسعتِ اثر ورواج عامہ کی منازل طے ہوتی رہتی ہیں ایک چیز کسی مقام پر وجود پاتی ہے عمل تقلیم وتنقیل سے منازل ارتقا کہیں اور طے کرتی ہے اور اثر ورواج کا حلقہ کہیں اور قایم ہوتا ہے۔ یہ فطرت کا فیضان عام ہے۔

نسل انسانی کی تاریخ ارتقا سے پتہ چلتا ہے کہ مدنیت کا رجحان طبعی، ارتقا کا سبب تحقیقی ہے۔ ورنہ یہ بھی حیوانات ارضی کی مانند ہی رہتا۔ مدنیت کا رجحان حیات انسانی کی بدلتی ہوئی اقدار کے سبب پیدا ہوا۔ موسم کے تغیرات سے پناہ لینے کے لیے، دھوپ کی تپش بارش کے سیل، ہواؤں کے جھکڑوں سے بچاؤ کے لیے مکانات کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ انسان کی ابتدائی تعلیم گاہ فطرت تھی۔ درختوں، جانوروں، پرندوں کے ذریعہ بہت سی باتیں حاصل ہوئیں مدنیت کے ابتدائی تصور میں جانوروں کے اعمال کا مطالعہ ومشاہدہ راہنما بنا۔ انسان کا اپنا تجربہ بھی ارتقار میں ممد ومعاون بنتا گیا۔ مدنیت کے اصول رسم ورواج، حرکت وعمل کے نتائج زوال وارتقا کے شکار رہتے رہے اور آج ہم ترقی کی موجودہ منزل پر اسلاف کے تجربوں اور کوششوں ہی کی بدولت پہنچے ہیں۔ ہماری حیات بھی حرکت پر مبنی ہے۔ اس لیے ہماری حیات کی اقدار بھی متحرک، متغیر، متبدل اور نمو پذیر ہیں۔ ترقی وتنزل کے اسباب حقیقی بھی یہی ہیں۔ اگر اقدار حیات میں سے کوئی قدر ان مراحل سے دوچار نہیں تو وہ خود بخود اپنا وجود ختم کرکے آغوشِ عدم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجاتی ہے۔

مدنیت نے انسانی تقسیم کار کی بدولت طبقات پیدا کیے اور ضروریات حیات نے گروہ قبائل بنائے۔ یہ گروہ تلاش معاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف کوچ کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان مراحل حیات میں تجربوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان تجربات کے اظہار کے لیے ذرایع تلاش کرنے پڑے، اس طرح نئے نئے الفاظ وجود میں آنے لگے سابقہ ضروریات ونتائج تجربات کے اظہار کے لیے جو الفاظ تھے وہ رفتہ رفتہ ذہنِ انسانی سے یا تو ختم ہوتے چلے گئے یا نیا مفہوم اختیار کرکے مروج رہے۔ جیسے "خلیفہ" ابتدا میں جانشین رسول اکرمؐ کے لیے استعمال ہوا۔ پھر اسلام کی مرکزی سلطنت کے حکمراں کے لیے استعمال ہونے لگا، اور بادشاہ شہنشاہ کا مترادف قرار پایا۔ یہ اس کا نقطۂ عروج تھا۔ زوال کا زمانہ آیا تو ابتدا میں استاد یا پیر کے نائب وجانشین کے لیے استعمال ہوتے ہوتے مطلق استاد کے معنی میں رائج ہوگیا۔ یہاں تک عزت، وقار، احترام کا کوئی نہ کوئی پہلو باقی رہا آخری منزل میں پہنچا تو کسی زندہ پیر کے کارندے، محصل اور کسی پیر کے مقبرے کے مجاور کو خلیفہ کہا جانے لگا اور اسی کے ساتھ ساتھ حجام بھی خلیفہ کے لقب سے ملقب ہوئے اب ہر نائی خلیفہ بن گیا: حضرت ابوبکر کی اولاد میں سے جن کا سلسلۂ نسب حضرت محمد ابن ابی بکر سے شروع ہوتا ہے ان میں سے بعض افراد اپنے نام کے ساتھ بھی لقط "خلیفہ" لکھتے اور کہلواتے ہیں۔ یہ اس کی نوعیت بالکل "قاضی" کی مانند ہے۔ یہ خاندانی نام ہے، صفاتی حیثیت سے نہیں ہے۔ اس لفظ کی آخری حیثیت کہ کارندہ محصل مجاور اور حجام کے لیے استعمال ہوتا ہے ابھی تک باقی ہے لیکن یہ بھی رو بہ زوال ہے اور مستقبل قریب میں ان طبقوں سے بھی معدوم ہوجائے گا۔ اور صرف تاریخ تک محدود ہوکر رہ جائے گا یا اگر احیا ہوا تو مفہوم نوے کر رائج ہوگا یہ اس کی حیات کا نیا دور ہوگا یہ لفظ لغوی حیثیت کے علاوہ ان معنوی ادوار سے گزرا ہے۔ (۱) جانشین رسولؐ (۲) بادشاہ، شہنشاہ (۳) جانشین پیر واستاد (۵) پیر کا محصل، کارندہ۔ مقبرہ کا مجاور اور حجام۔ اس آخری

دور کے آثار کہیں کہیں باقی ہیں۔

اس لفظ کی منازل عروج و زوال سے معلوم ہوا کہ الفاظ تغیر کا شکار رہتے رہے ہیں۔ ان تغیری مراحل میں معنوی حیثیت کے علاوہ صوری ہیئت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بعض کی املائی اور لہجائی شکل ایسی بدل جاتی ہے کہ اپنی اصل سے اسے کوئی مناسبت ہی نہیں رہتی۔ بعض کے تبدل کی درمیانی اشکال باقی رہ جاتی ہیں اور بعض کی بالکل نابود ہو جاتی ہیں مثلاً "بہرام" (نام بادشاہ ایران) اصل میں "وِرِثْرَغْن" تھا یہ نام قدیم ایرانیوں میں بارش کے دیوتا کا نام تھا جو اپنے نیزے سے بادلوں کو ہنکاتا اور بارش کرتا ہے۔ سنسکرت میں اس کا نام "درتر ہان" تھا فارسی میں درثرغن کی ثقالت دور ہو کر "درہران" بنا اور ساسانیوں کے زمانے میں "وہران" پھر "وہرام" بن کر بہرام کی شکل میں مروج ہوا اور اب تک ہے۔ لفظ خدا بھی اسی طرح تغیر و تبدل عروج و ارتقا کا شکار ہوا ہے۔ اس کے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو مقصود ہے۔

خدا: یہ لفظ تقریباً آٹھ ہزار سال سے زبان زد خاص و عام ہے۔ حسب ذیل معنی میں سب متفق ہیں: (۱) اللہ، ذات واجب الوجود (۲) مالک، آقا، صاحب، حاکم، بادشاہ۔ یہ لفظ بحالت مفرد کبھی ذات باری تعالیٰ اور کسی کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ بحالت مرکب کسی اسم کے ساتھ بحالت مضاف معنی ۲ میں استعمال ہوتا ہے جیسے کہ خدا، ناخدا وغیرہ۔

جس لغت نویس نے ان معنی اور تشریح سے آگے قدم بڑھایا اس نے ٹھوکر کھائی۔ یعنی اس مفرد لفظ کو مرکب بتانے اور اجزائے ترکیبی کی تلاش میں ان حضرات کے قیاس نے لغزش کی ہے اس دور عاصر سے پہلے کے تمام قدیم لغات نویس اور ان کے متبعین نے اس لفظ کو مرکب قرار دیا کہ یہ لفظ خدا مرکب ہے۔ خود + آ (امر از آمدن) سے جس کے معنی ہیں خود آنے والا۔ صاحب غیاث اللغات نے اس ترکیب کو بحوالہ خان آرزو، صاحب سراج اللغات، علامہ لاہانی اور علامہ فخر الدین رازی سے منسوب کیا ہے۔ صاحب فرہنگ نظام نے صاف صاف تو مرکب نہیں لکھا لیکن ان کے بیان سے مرکب ہونا مترشح ہے وہ لکھتے ہیں:

"در عصر اوستائی ذات واجب الوجود را بغذ (ب ـــ ۹ ـــ) و آہورہ (ـــ ـــ ۱ ـــ) و مزدہ (6 - 9 ـــ) میگفتند و در عصر ساسانی آہرمزدہ و خدای (خوتای) (ـــ ۳ ـــ) و در فارسی اسلامی علاوہ بر الر عربی خدای پہلوی ہم استعمال شد۔ ریشۂ لفظ خدا در اوستا ختع (۳ ـــ ۳ لجہ) است بمعنی بخودی خود (واجب الوجود) کہ مخلوق دیگری نیست و در سنسکریت سوتہ (स्वत) بہمان معنی است۔ سو (स्व) کہ یک حرف مرکب در سنسکریت است در اوستا و فارسی بہ حرف خ تبدیل شود"

(فرہنگ نظام ج ۲ صفحہ ۵۴۸)

ان دونوں بیانات پر بحث کرنے سے پیشتر ایک اور جدید تحقیق ملاحظہ فرمائیے یہ بیان بہت طویل ہے اسمیں مندرج امور کو ہم بالترتیب مختصراً پیش کرتے ہیں اس مضمون میں۔ خدا کو سہ لفظی مرکب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ خلاصہ یہ ہے:

(ا) "خود" اور "خدا" کا ماخذ ایک ہے اور دونوں میں "خو" بمعنی فطرت، حقیقت، عادت، جبلت اور خصلت شامل ہے۔ سنسکرت میں اس کا مثیل باہم قبیل لفظ "سو" (स्व) ہے جس کے معنی خود، آپ اور روح ہیں "سو" پر "تس" اضافہ ہوا اور "سوتس" یا "سوتہ" بنا۔ جس کے معنی خود بخود یا آپ سے ہوئے۔ فارسی میں "خوت" تھا جس نے "خود" کی شکل اختیار کی لہٰذا "خود" اور "سوتہ" جس طرح یکساں ہیں اسی طرح "خو" اور "سو" بھی ہیں۔ "سوتہ" مرکب ہے۔ سو + تہ سے اسی طرح "خود" مرکب ہے۔ خو + دے۔

(ب) خدا کی قدیم شکل "خودای" (پاژند)۔ قدیم تر "خوتای" (پہلوی اشکانی) "خوتاذ" (پہلوی ساسانی)، اور قدیم ترین "خودھائی" (قدیم فارسی)، "خودای" (اوستائی) ہے۔ ارتقائی ترتیب یہ ہے: خودھای، خوتای، خودای، خدای، خدا۔ مگر "ت" کا تبادل "د" سے مسلم ہے "خوتای" سے "خودای" ہو سکتا ہے۔ "خودھای" کے "دھ" کا تبادل "ت" سے خلاف اصول ہے۔ اس لیے سہل بات یہ ہے کہ "خوتای" کو "خودھای" سے ماخوذ خیال کیا جائے۔ اور "دھ" کا تخفیف پا کر "د" ہو جانا قبول کیا جائے۔

(ج) فارسی "خود" اور سنسکرت "سوتہ" یکساں ہیں جو مرکب ہیں۔ خو + دا اور سو + تہ سے "خدا"۔ خود، سو + کسی اور دوسرے کلمہ سے مرکب۔ ڈاکٹر

پلیٹس یہ دوسرا کلمہ "ذات" فارسی اور "دھات" سنسکرت بتاتے ہیں پس خود: خوت + دات و خوتو دات۔ اور سوتہ + دھات، سوتر دھات یعنی وہ ہستی جو اپنی ذات سے زندہ اور پائندہ ہو۔

(د) صاحب فرہنگ نظام نے صحیح لکھا ہے کہ خدا کا اوستای مادہ "خوتو" اور سنسکرت "سوتہ" ہے جس کے معنی واجب الوجود بخودی خود ہیں۔ لیکن خوتو خدا کا ایک جزء ہے دوسرا جز "دات" ہے۔ "خوتو دات" اولاً "خوتاد" (بحذف "و" بتبدیل "ت" بہ "د") ہوا اس کے بعد "خوتای" (بحذف "د") ہوا، یا خوتو دات خودای (بحذف "ت") ہوا اور پھر "خدای" سے "خدا" ہو گیا۔

(ہ) مسٹر وان نولدیکے، "خوتای" پہلوی کو سنسکرت "سوتہ + آی (عمر) سے ماخوذ بتاتے ہیں بمعنی اپنی ذات سے زندہ۔

(و) "خوتای" بمعنی حاکم، مالک، قادر (بادشاہ) مستعمل تھا۔ ساسانی عہد میں خالق و مالک کل (اہرمزد) کے لئے استعمال ہوا۔ قدیم فارسی میں بھی بمعنی اللہ استعمال ہوا ہے، کتاب گجستک ابالش (پہلوی) میں ہے۔ "لخوار دل لوین او ہرمزد خوتای بدروند" (باز پیش اہرمزد خدا ببرند) البتہ جدید فارسی اور اردو میں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اگر ان توجیہات و قیاسات کو صحیح مان لیا جائے تو یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ قدیم الایام سے چند تراکیب، اردو، فارسی میں مستعمل ہیں جن میں لفظ خدا بمعنی مالک استعمال ہوا ہے جیسے، کدخدا، دہ خدا، ناخدا وغیرہ پس ان معنی کے لیے کیا وجہ جواز ہوگی۔ اگر اللہ کی صفت، مالکیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بطور مجاز، یہ معنی تصور کیے جائیں تو خدائی نامہ بمعنی شاہنامہ موجود ہے جس میں "خدا" بمعنی بادشاہ ہے اس کی کیا توجیہہ ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ قدیم فارسی میں بمعنی مالک، آقا، بادشاہ اور بادشاہ بزرگ (شہنشاہ) استعمال ہوا ہے۔ بمعنی اللہ نہیں ہے۔ مندرجہ بالا آراء بوجوہ ذیل قابل قبول نہیں ہیں۔

اجزائے ترکیبی، خود + آ، خدا بمعنی خود آنے والا، ذات واجب الوجود، خلاف قاعدہ ہیں جن کا عہد قدیم میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ قیاس کی لغزش ہے۔ "سوا" سنسکرت فارسی "خ" سے تبدیل ہو سکتا ہے لیکن فارسی میں "ختو" نہیں ہے "خوتای" ہے۔ فارسی میں "و" کا تبادل "الف" سے ثابت نہیں ہے۔ خوتای کے معنی واجب الوجود، بخودی خود، قدیم فارسی میں نہیں ہیں بلکہ بادشاہ وغیرہ ہیں۔ مزید بحث آگے ہوگی کیوں کہ طویل بیان کے سلسلہ میں یہ باتیں بھی زیر بحث آجائیں گی اس بیان کے خلاصہ کی ترتیب کے مطابق امور مذکورہ پر غور کرتے ہیں۔

(ا) خود اور خدا کا ماخذ "خو" بمعنی فطرت و عادت قرار دینا قیاس مع الفارق ہے کیوں کہ "خو" بمعنی فطرت و عادت ابتدا میں "خیم" تھا پہلوی زبان کی کتابوں کے یہ نام دلیل ہیں "ایرخیم و خرد فرخ مرت" (درخوی و خرد مرد فرخ) "ابوالبخ خیم ہوسرواں" (در بیخ خوی خسرواں) ان کے علاوہ "وزخیم" بمعنی بدخو، بدخصلت فارسی میں بحال موجود ہے۔ پس خو جس کی ابتدائی شکل خیم ہے خود محتاج تحقیق ہے۔ خیم کی "م" نذر ساقط ہوئی اور "ی" کا تبادل "و" سے ہو کر خو بنا، خیم دور پہلوی تک تھا اس کے بعد خو کی شکل اختیار کرتا ہے پس قدیم فارسی میں خو تھا ہی نہیں تو یہ خدا اور خود کی اصل کیسے بن سکتا ہے۔ نیز خدا کی ابتدائی شکل "خوتای" میں جو "خو" ہے وہ اوستا کا ایک مفرد حرف (ہے) ہے اور تلفظ میں واو معروف نہیں بلکہ واو معدولہ ہے حالانکہ "خو" بمعنی عادت میں واو معروف ہے۔ پس اس سے خود بنانا اور پھر خدا کا ماخذ قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ اگر خود میں اس "خو" کو اصل قرار دیں تو پھر خویش، خوش، خواب، خواہش، خوب، خور، خوار میں بھی اس کو اصل قرار دیا جا سکتا ہے حالانکہ ایسا ممکن نہیں۔ خود کے معنی آپ اور اس کے ہم قبیل یا مثیل سنسکرت سوتہ کے معنی، خود بخود، آپ سے میں مطابقت کیوں کر ہو سکتی ہے۔

(ب) خدا کی قدیم ترین شکل "خودای" نہیں بلکہ "خوتای" ہے۔ فارسی باستان کا کوئی محفوظ نہیں جس میں اس کا سراغ مل سکے۔ چند سکوں اور کتبوں کے علاوہ فارسی قدیم کے آثار ناپید ہیں سکوں میں لاحقہ دات ملتا ہے۔ دھ یا دھات کا وجود نہیں جیسے "بغ دات" "سپند دات" "میثر دات" وغیرہ اس کے معنی عطا ہے۔ بغ دات: خدا داد ہے۔ عہد ہخامنشی کے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں "بغ" بمعنی پروردگار عالم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ خوتائی، خودای، خودھای نہیں ہے، فارسی قدیم، اوستا، پہلوی، ساسانی اور پہلوی اشکانی میں ذات الٰہی کے لئے بغ، مزد، اہورمزدا، یزتان، یزداں، یزد استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس معنی میں خوتای، خودای، خودھای کا وجود ہی نہیں ہے۔ خوتای بمعنی بادشاہ و بادشاہ بزرگ عہد قدیم (پہلوی) سے مستعمل ہے۔ خوتاذ بھی پہلوی اشکانی میں نہیں بلکہ خوتای خوذای ہے۔ اس ضمن میں جو سہل طریقہ استعمال کیا گیا ہے اس سے زیادہ سہل طریقہ تو خود + آ یعنی خود آنے والا، اپنی ذات سے وجود میں آنیوالا واجب الوجود ہے۔ ارتقائی ترتیب بھی غلط ہے۔ البتہ خوتای، خوذای، خذای، خدای، خدا ارتقائی ترتیب ہے۔

(ج) خود یہ خو + ت یا داور سوتہ = سو + تس یا تہ، کے معنی "آپ سے یا خود بخود" معین کیے گئے ہیں۔ ان دونوں کو خدا کی اصل قرار دینے کے لئے ایک اور کلمہ "دات" فارسی اور "دھات" سنسکرت کا اضافہ کرکے، خدا تک سلسلہ پہنچایا گیا ہے اور معنی اپنی ذات سے پائندہ یا زندہ کیے گئے ہیں۔ پس خو + یاد + دات میں "خو" کے معنی فطرت ت یاد: دہ' دل کے معنی میں خلقت، اور دات کے معنی خلقت و عطیہ ہیں جیسے "بن دھش" بمعنی اصل خلقت اور "بغ دات" بمعنی عطیہ الٰہی ہے اگر ان لاحقوں کے ساتھ خو بمعنی عادت و فطرت تسلیم کرکے معنی متعین کیے جائیں تو خلقت و عطیہ فطرت معنی بنتے ہیں ظاہر ہے کہ اس سے واجب الوجود کا مفہوم متعین نہیں ہوسکتا کیوں کہ فطرت خود تخلیق میں خالق کی محتاج ہے۔ پھر اختلاف تلفظ خدا، خِدا، خُوَدا، خدا کی حالت میں "خو" بمعنی فطرت سے کیسے مطابقت ہوگی؟

(د) صاحب فرہنگ نظام نے "خوتو" نہیں بلکہ "ختو" لکھا ہے جس کو انھوں نے پہلوی رسم الخط میں بھی "ختو" ہی ظاہر کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک سو (Fq) سنسکرت، فارسی "خ" سے بدل جاتا ہے۔ "خو" سے نہیں۔ نیز مؤلف فرہنگ نظام "ختو" کے معنی بخودی خود بتلاتے ہیں اور اس بیان میں "خوتو" پر دات لاحقہ کا اضافہ اور کیا گیا ہے۔ اگر ان کے معنی کیے جائیں تو لفظ مہمل بن جاتا ہے کیوں کہ فارسی میں دات: داد بمعنی عطیہ ہے جس کی مثالیں کافی ہیں لہذا "ختو": بخودی خود، "ختوات" یعطیہ بخودی خود یعنی چہ؟ سنسکرت سے ہر قدیم لفظ کی تطبیق ناممکن ہے۔

(ہ) سوتہ + آی: خوتہ + آی یعنی اپنی ذات سے زندہ کی نظیر فارسی میں نہیں ملتی۔ خود + آ کی ترکیب اس سے زیادہ قرین قیاس ہوسکتی ہے حالانکہ وہ بھی غلط ہے۔

(و) خدا، قدیم فارسی میں، مالک، آقا، بادشاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے خالق کل کے معنی میں نہیں۔ اور ہرمزد خوتای میں "خوتای" کے معنی آقا یا بادشاہ ہی کے ہیں بمعنی واجب الوجود نہیں۔ اور ہرمزد خوتای یعنی اورمزد آقا یا بادشاہ عہد ساسانی سے پہلے بمعنی اللہ کیوں نہیں استعمال ہوا؟ جبکہ اس طویل بیان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے معنی واجب الوجود ہی ہیں قدیم ایرانیوں میں اللہ کے لیے واجب الوجود کا تصور ہی غیر محقق ہے تو اس کے لیے یہ لفظ بنانا یا بتانا ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ آخر میں خود بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اوستا اور پہلوی اشکانی میں بمعنی مالک و بادشاہ تھا اور یہ دونوں دور ساسانیوں سے مقدم ہیں۔ پس منطقی طور پر استدلال ہی غلط ہے کہ لفظ اصل کے لحاظ سے ابتدا میں اپنے معنی میں مطابقت نہ رکھے، یہ بات بداہتہً غلط ہے کیوں کہ لفظ کی تخلیق ہی معنی کے پیش نظر ہوتی ہے۔ اگر یہ لفظ واجب الوجود یا بخودی خود کے پیش نظر وجود میں آتا تو ابتدا میں یہی معنی مروج ہوتے تبدیلی بعد میں واقع ہوتی۔ پس جبکہ ابتدا میں یہ معنی ثابت نہیں تو ان معنی کا قیاس کرنا ہی غلط ہے اور اجزائے ترکیبی تلاش کرنا نرمی ہوشنگ کی ہے معنی ہی کی صحت سے ترکیبی اجزا کی صحت ثابت ہوسکتی ہے۔ ابتدا میں، بادشاہ، مالک، آقا کے معنی میں استعمال ملتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہی معنی کے لئے یہ لفظ وضع ہوا اور ان معنی سے مرکب کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ قدیم فارسی میں ذات الٰہی کے لیے کون کون سے لفظ مستعمل تھے خدا کب سے مستعمل ہے، معنی کیا تھے، املائی اور لہجائی اشکال کیا کیا تھیں، ان امور کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فارسی قدیم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے، بَغ، مَزْدَ، اَہُورامَزْدَہ، یزتان، یزدان اور یزد، الفاظ ملتے ہیں بغ بادشاہ آثور کے کتبہ سارگون میں ایک ایرانی کے نام (بغ دانی) کے جز کی شکل میں ملتا ہے۔ کتبۂ داریوش میں "بغ یدایش" خدا کی ستائش کے مہینہ کا نام ملتا ہے۔ دیگر کتبوں اور اوستا میں بھی بغ بمعنی خدا آیا ہے "بغ دات" اور "بغ کرت" دو بادشاہوں کے نام ہیں "اتورخورنہ بغ" یعنی آتش جلالت ایزدی ایک آتشکدہ کا نام ہے۔ ساسانی بادشاہوں کے زمانہ کے سکوں میں بھی بغ بمعنی خدا پایا جاتا ہے۔ اس عہد کے بعد اس لفظ کی حالت بدلتی ہے تدریزوال ہوتا ہے اور بجز چند مرکبات بالکل زبان سے نابود ہوجاتا ہے۔ کتبۂ شاہ پور سکانشاہ میں بھی یہ لفظ موجود ہے:

"مَزْدَیَسْن یعنی شَہپُوہْرِی شَہانِ شَہی شَہانِ شَہی اَیران و اَنیران کِی چیتر ہیچ یزدان" یعنی خدا پرست و خدائگاں شہپور شہنشاہِ ایران و غیر ایران جس کا خاندان خدا سے پیوستہ ہے۔

ساسانی سکوں پر یہ عبارت کندہ ہے جس میں مزد، بغ، یزدان بمعنی خدا آئے ہیں: "مزْدَیسنی یعنی شہپوہری ملکان ملکا، ایران منوشتر من یزدان" یعنی خدا پرست خدائگان شاہ پور شہنشاہ ایران، جس کا خاندان خدا سے تعلق رکھتا ہے۔

خط میخی مادی میں خط میخی آشوری پر چھ علامتوں کا اضافہ ہوا ان میں دو علامتیں "اہُرمزدا" اور "بغا" بھی ہیں جن کے معنی خدا اور خدا بزرگ ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے متعلق ملک الشعرا بہار لکھتے ہیں: "در عہد ہخامنشی و تا چند قرن بعد بغ نام پروردگار عالم بودہ است" اور "اورمزد در اصل اہورا

مزدہ بمعنی خداوند بزرگ بودہ است" مطلق مزدہ بمعنی خدا استعمال ہوتا ہے۔ "مزدیسن" مرکب ہے مزد بمعنی خدا اور یسن بمعنی عبادت کرنیوالا خدا پرست۔ تغیر کی تدریج ہوتا ہوا "اہورمزدہ" اسم ذات الٰہی سے بادشاہ کا نام بن گیا۔ اہورمزدہ، اورمزدہ، اہرمزد، ہرمزد تغیری اشکال ہیں "یزتان" بمعنی خدا کتیبۂ اردشیر پاپکان میں پایا جاتا ہے "ارتخشتری ملکان ملکا اریان منوشیہر من یزتان" (اردشیر شاہان شاہ ایران دارندۂ نژاد از خدایان کہ تبادل ہوسے ہوکر یزدان بنا اسی طرح ایزد، یزد ہوگیا۔ "یزدکرت" یزدکرد ہے۔

خدا، دراصل "خوتای" تھا جس کے معنی بادشاہ، سردار، فرماں روا، مالک اور آقا ہیں، پہلوی زبان میں انہی معنی میں استعمال ہوا ہے اس کی املائی اشکال، خوتای، خوذای، خودای، خذای اور خدا ہیں۔ کارنامۂ اردشیر پاپکان میں یہ عبارت ہے:

"پس ہیچ مرگ الکساندری اودلیک ایران شہرو ۲۴۰ کتک خوتای بوذ" (سکندر رومی کے مرنیکے بعد ایران ۲۴۰ کد خدا (سردار یا فرماں روا) رہتے اسی طرح "چیزک ہندرچ فرجودکیشاں" میں ہے "فریوپانیہ ایں کہاد ہرمزد پت ہستیہ ہماک بوذیہ دانو شنگ خوتائیہ" (بداست اعتقادی یہ ہے کہ ادہرمزد (اللہ) کی ہستی دایم و بادشاہی جاوید ہے) اسی طرح "شترہای ایران" میں لکھا ہے "انیگ بگجتاک سکندر سوہست واندرود دریا پ فگندد نیکرتی ہپت خدایاں" (پس سکندر ملعون نے دنبگتہ ہفت خدا کو جلاکر دریا میں ڈالدیا) ہفت تنا یعنی سات بادشاہ۔ اصطلاح کتب سنت پہلوی میں، ہفت خدایاں (سات بادشاہ) جم، فریدون، منوچہر، کاؤس، کیخسرو، لہراسپ اور ہشتاسپ تھے۔ اور سہ خدائیہ: سہ خدا سے مراد اردشیر پسر اسفندیار، دارا اور دارای داریان ہیں اور اشکانیوں کو اصطلاحاً کنگ خوتای و کد خدا کہتے تھے نہ کہ خوتای: خدا بمعنی بادشاہ بزرگ رسالہ اندر آئین نامہ نویسی کی اس عبارت میں یزداں بمعنی اللہ اور خدا بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے "بداز زرتشت پیشمان ..... اپیشرک بہ گوید، پذیرد بنام اندر یزدان، آفریگان اندر خدایان" (پاک جان زرتشت کے لیے تعظیم ہے ..... خاصکر اس کا قبیلہ و خاندان خدا کے نزدیک مقبول اور بادشاہوں کے نزدیک صاحب عزت ہے)

پہلوی میں "خوتای نامک" "شاہنامہ اور" اور "پتخان کتک خدای" "برہمیان کد خدای" کتابوں کے نام ہیں۔ خوتای نامک کا ذکر جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں بھی کیا ہے۔ اس کی حقیقت ملک الشعرا بہار نے جو بیان کی ہے وہ ہر طرح قابل غور ہے: "خوتای بواد معدولہ یعنی خدا کہ در قدیم بمعنی بادشاہ، صاحب بودہ و بعد از اسلام تطور یافتہ معنی اہورمزدا را بخود گرفت، (خوتای نامک) خدائنامہ بہمانست کہ شاہنامہ شد" لفظ خداوند خواجہ کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ایں ہر دو لغت (خواجہ و خداوند) ظاہراً در فارسی دری بعد از اسلام از لغت خوتای پہلوی کہ یعنی صاحب و آقا و مدیر و گاہی ہم لقب فرشتگان چو ماہ خدای و دیرند خدای وغیرہ بودہ بوجود ساختہ شد، چہ خدای را در اسلام بجای اللہ و رب عربی گزاشتند و برائے شاہ و صاحب و آقا خداوند را با ضمیمہ وند کہ از ادات تشبیہ یا نسبت است ساختند کہ از ہماں ریشہ ولی عین آں نباشد"[1]

مندرجہ ذیل بیانات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آخری بیان سے تلفظ اور املا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"خدا کہ نام پادشاہ بود بعد از اسلام مختص ذات باری تعالیٰ قرار گرفت با آنکہ مشتقات آں چو خانۂ خدای، کتخدای و دہخدای و کشور خدای وغیرہ بحال خود باقی ماند و معنی اصلی را کہ صاحب باشد محفوظ داشت"[2]

"خدای را کہ ما بروزن شما ادا مینمائیم در زمان فردوسی "خوذای" بواو معدولہ بزبان میآوردہ اند" ..... بختیاریان، خار مفتوح و طبرستانیان، خار مکسور و سائرین خار مضموم ادا سازند چوں، خودا، خدا، خذا، خذا ایہ[3]

پس نتیجہ یہ نکلا کہ خوتای، خوذای، خذای، خدای سے خدا ہوا ہے اس کے معنی، بادشاہ، صاحب، مالک، اور آقا کے تھے۔ وہ خدا و کد خدا اور ناخدا میں بمعنی مالک اور خدائنامہ میں بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے۔ دیرند خدا، زروان کا لقب ہے جو فرشتۂ دہر (زمان و مکان) ہے اس میں

---

[1] بک شناسی ص ۴۲ ج ۱، [2] ایضاً ص ۱۸۳ [3] ایضاً ص ۲۶۷ [4] ایضاً ص ۱۹۳

بھی خدا کے معنی مالک یا صاحب کے ہیں دیر ند خداء مالک دہر، صاحب زمان و مکان۔ عروج اسلام اور بالخصوص رواج تصوف کے بعد اس لفظ کو بمعنی اللہ، ذات واجب الوجود استعمال کیا گیا ہے۔ پس یہ قیاس کہ یہ مرکب ہے اور قدیم سے اللہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ غلط ہے اوہرمزد کے ساتھ خدا کا استعمال بمعنی بادشاہ ہے۔ جبکہ پہلوی سے پہلے اس کا وجود ثابت نہیں ہے تو فارسی قدیم میں کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلوی میں بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے تو معنی تخودی خود یا واجب الوجود کیسے ہو سکتے ہیں۔ قدیم آثار بصورت مرکب بمعنی صاحب و مالک و فرمانروا تا حال پائے جاتے ہیں جیسے وہ خدا دکھیا، نمبردار) کشور خدا (فرمانروائے ملک) کدخدا (صاحب خانہ) ناخدا (ناؤ کا مالک) وغیرہ بمعنی حاکم و فرماں روا طبری نے چند القاب لکھے ہیں جیسے وردان خداہ، بخارا خداہ وغیرہ یعنی فرمانروائے وردان اور بخارا۔ طبری دور اول کا مورخ ہے اس نے یہ القاب براہ راست پہلوی کتب خوتای نامک وغیرہ سے اخذ کیے ہیں۔

لسانیات میں اس اصول سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ لفظ مادہ کے لحاظ سے جس معنی پر دلالت کرتا ہے ابتدا میں وہی معنی مروج ہوتے ہیں اضافی یا مجازی معنی بعد میں رائج ہوتے ہیں۔ جو تغیر و تحول کے زیر اثر مراد لیے جاتے ہیں مثلاً گلستاں، بلحاظ ساخت (اجزائے ترکیبی) گلاب کے تختے یا پھولوں کے قطعے کے معنی رکھتا ہے ابتدا میں اسی معنی میں مستعمل ہوا بعدہٗ مجازاً باغ کے لیے بھی استعمال کرنے لگے یہ ناممکن ہے کہ بلحاظ ساخت تو گلاب یا پھولوں کے لیے تختے کے لیے مخصوص ہے مگر ابتدا ہی میں باغ کے لیے استعمال کرنے لگے اور دو چار صدیاں گزرنے کے بعد ہوش آیا کہ باغ کے لیے استعمال غلط ہے یہ تو تختۂ گل کے معنی رکھتا ہے۔ خدا جبکہ قدیم فارسی، اوستا اور پہلوی اشکانی و ساسانی میں اللہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا تو بلحاظ ساخت، بلحاظ مادہ اس کے یہ معنی کس طرح ثابت ہو سکتے ہیں۔ اجزائے ترکیبی کی معنی سے مطابقت معنی کی موجودگی ہی میں ثابت کی جا سکتی ہے حالانکہ لفظ خدا بمعنی اللہ ذات واجب الوجود فارسی میں عہد اسلام میں استعمال کیا گیا ورنہ پہلے بمعنی بادشاہ مالک وغیرہ استعمال ہوتا رہا ہے۔ پس اجزائے ترکیبی کی حیثیت قیاسی موشگافی سے زیادہ نہیں ہے۔ میرے نزدیک خدا دو معرو ہے ابتدا میں اس کے معنی، بادشاہ اور مالک تھے اسلام کی اشاعت کے بعد بمعنی اللہ استعمال ہونے لگا۔

جی ہاں! آگ میں پھول بھی کھل سکتے ہیں

خدا نہ کرے لیکن اگر آپ کے جسم کا کوئی حصہ جل جائے یا چوٹ آجائے، یا خراش پڑ جائے، تو جلن اور سوزش کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جیسے آگ ہو۔ اس موقع پر فوری جلمار کا استعمال کیجیے۔ جو آپ کی اس آگ میں پھول کھلا دے گی

FOR BURNS SCALDS & ABRASIONS USE

JALMAR

A CIPLA product

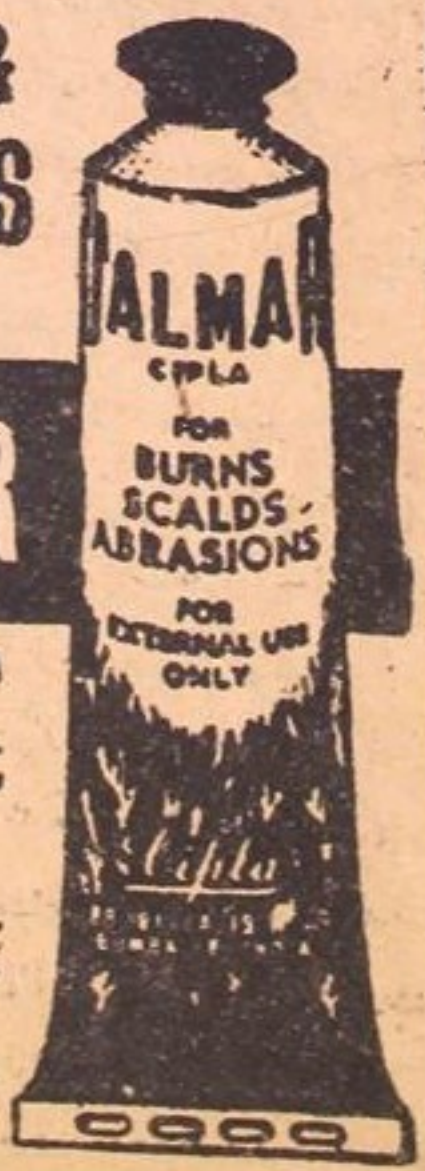

بنا بنوائے:-

سپلا لیبارٹریز۔ بمبئی ۸

ماثر الامرا کی تاریخی فروگذاشت

سید نقی احمد ارشاد

مولانا امتیاز علی خاں عرشی وقائع عالم شاہی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حصول اقتدار کے لئے ان طاقتوں (مرہٹہ، روہیلے، سکھ اور انگریز) نے جو پیہم کوشش کی اس کی روداد تاریخ کی مختلف کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ مگر ان کے مصنف کسی نہ کسی ایسی سرکار کے متوسل تھے جو فریق کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے ان تصانیف کا دامن جانب داری سے بالکل پاک نہ رہ سکا۔ اس عہد کی مختلف تاریخوں کو پڑھئے اور پھر کسی ایک واقعہ کے اسباب و علل متعین کرنے کی کوشش کیجئے، بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بغیر کوئی کتنہ بینی کئے آپ حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے"

یہ ریمارک بالکل صحیح ہے اور اس اعتبار سے تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ خود مورخ کے کردار اخلاق اور تعلقات کا بھی جاننا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ آج تک یہی مشہور ہے کہ ماثر الامرا نے نہایت غیر جانبداری سے واقعات کو جہان بین کے پیش کیا مگر جب میں نے غور سے دوسری تاریخوں کے حوالے سے مطالعہ کرنا شروع کیا تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ صرف امرائے اکبری جہانگیری کا تمام حالات مستند تاریخوں سے رجوع کئے گئے ہیں اور ان میں خامیاں نہیں ہیں مگر عہد اورنگ زیب کے بعد سے جن امرا کا حال بیان کیا گیا ہے ان میں صاف صاف جانب داری کی جھلک پائی جاتی ہے۔

ماثر الامرا بظاہر میر عبدالرزاق خاں (شاہ نواز خاں صمصام الدولہ) کی تالیف ہے مگر ان کی شہادت ۱۱۷۰ ہجری کے بعد ان کے صاحب زادے میر عبدالحی نے اس تاریخ میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ خود میر عبدالحی تحریر فرماتے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد شاہ نواز خاں سے کہا۔

"روزے محرراں کلمات ظاہر بخود کہ نسخہ خوبے تمہید یافتہ۔ اگر اتمام می پذیرفت۔ آں بزرگ برزبان آورد کہ تو تمام خواہی کرد"

چند سطروں کے بعد "چوں راقم سابق فرمودہ آں بزرگ بخاطر می خلید ہموارہ بخیال آں سرگرمی داشت۔ تا آنکہ در سال ۱۱۸۲ ہجری شروع نمود۔ احوال تتمہ مردم (از کتاب تاریخ فراہم آوردہ انضمام داد و تمہیدے (کہ والد مرحوم در ابتدا خود نوشتہ و محررہ بیاضے نقل گرفتہ بود) بعبارت تمہیدے (کہ بہ آزاد نوشتہ) یا چہار ترجمہ (کہ آں ہم رقوم قلم میر آزاد است) نیز ثبت فرمود" شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ ہجری میں عالم قید میں تسلی کر دیئے گئے۔ چنانچہ میر غلام علی آزاد بلگرامی مذکور نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

رفت صمصام الدولہ ز جہاں — سوم ماہ شریف رمضان
سال ایں واقعہ آں سید خود — گفت ماکشتہ عبدالرحمان

عبدالرحمان یحییٰ سے مراد حیدر جنگ جو پانڈی چری کے فرانسیسیوں کا پروردہ اور نمک خوار تھا۔ میر عبدالحی (شمس الدولہ دلاور جنگ) خلف شاہ نواز خاں نے تاریخ اتمام ماثر الامرا یوں پیش کی ہے ؎

دبیر عقل رقم کرد سال اتمامش — زہے ادیب مصاحب مآثر الامرا

گویا شاہ نواز خاں کی موت ۱۱۷۱ھ کے ۲۳ برس بعد یہ کتاب تمام کی گئی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ میر جعفر کے بعد میر قاسم، پھر میر جعفر کی دوبارہ مسند نشینی ۱۱۷۷ھ، نجم الدولہ خلف میر جعفر اور سیف الدولہ تک کے حالات میر زا مہدی علی وردی خاں مہابت جنگ) کے حالات کے ساتھ درج ہیں۔ میر جعفر سے لے کر سیف الدولہ ناظم بنگال کے حالات شاہ نواز خاں کی وفات کے بعد کے ہیں۔ اس وقت تاریخ بنگالہ نہیں لکھی گئی تھی۔ اس لئے محض سنی سنائی باتوں سے کام لیا گیا ہے۔

غلام علی آزاد اپنے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"ترجمۂ قطب الملک عبداللہ خاں وزیر اعظم محمد فرخ سیر بادشاہ (کہ مصنف علیہ الرحمۃ بقلم داد بود) بہ سعی مؤلف در آمد و ترجمۂ امیر الامرا سید حسن علی خاں برادر قطب الملک از دل ناقص بدست افتاد۔ و ترجمۂ نواب اصف جاہ و خلف او نواب نظام الدولہ شہید، مصنف علیہ الرحمۃ خود بہ تحریر درنیاورد و تنگ چشمی روزگار فرصت نہ داد۔ جلالت شان ایں ہر چہار امیر آفتاب نظیر ظاہر۔ اتفاقاً فقیر تراجم اربعہ را در تالیفِ خود سرو آزاد این رقم پرشانیدہ۔۔۔۔"

خلاصہ یہ کہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان چار امرا کے حال کا اضافہ کر دیا ہے۔ اتنی طویل عبارت سے مطلب یہ نکلا کہ درحقیقت مآثر الامرا تین اشخاص کی تالیف ہے۔ اول شاہ نواز خاں جنھوں نے ۱۱۷۱ھ کے بہت پہلے یعنی ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۶۰ھ کے درمیان اس کتاب کو لکھا۔ اس پانچ برس میں جب مخاطب نواب آصف جاہ اول تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں بعد رحلت آصف جاہ اول ان کے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ ریاست دکن پر بحال ہوئے اور شاہ نواز خاں اپنے قدیم آقا مرزا کے سرپرست سے وابستہ ہو گئے۔ مآثر الامرا کی تالیف بند ہو گئی یہاں تک کہ ۱۱۷۱ھ میں جب ناصر جنگ قتل کر دیئے گئے۔ میر عبدالحی خاکسار جو قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند تھے وہ ۱۱۷۲ھ میں حراست سے باہر کیے گئے اور ۱۱۸۲ھ میں مآثر الامرا کی از سر نو ترتیب و تدوین شروع کی جو یہاں تک کہ ۱۱۹۴ھ میں غلام علی آزاد نے تتمہ و مقدمہ اور حالات کے ساتھ اس کتاب کو مکمل کیا۔ جو مزید اضافہ حالات سے خود ظاہر ہے۔

چونکہ یہ کتاب دکن (اورنگ آباد) میں تالیف و تصنیف کی گئی اور اس کے مولفین و مرتبین کا تعلق ریاست حیدرآباد سے رہا، اس لئے امرا شاہی و احمد شاہی میں بعض ایرانی جماعت کے امرا کا ذکر بالقصد نہایت دلکش الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نظام آصف جاہ اول کا تعلق تورانی پارٹی سے تھا جو ایرانی پارٹی کی حریف سیاست کی۔ یہ پارٹی بعد نادر شاہ میں زوروں پر تھی اور انہیں دو پارٹیوں کی سیاسی بازی گری نے حکومت مغلیہ کا خاتمہ کر دیا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ مورخ کے کردار کا بھی جاننا ضروری ہے اور بغیر اس کے اس کی تصنیف یا تالیف پر پوری روشنی نہیں پڑ سکتی ہے اس لئے مختصر آشاہ نواز خاں کا حال درج ذیل ہے۔

شاہ نواز خاں کا اصلی نام میر عبدالرزاق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اجداد خواف کے سادات تھے۔ ان کے جد اعلیٰ کمال الدین عہد اکبری میں خواف سے ہندوستان آئے۔ شاہ نواز خاں کے دادا میر رستم خاں مرتان کے دیوان تھے۔ شاہ نواز خاں کے والد کا نام میر حسن علی تھا۔ یہ خاندان اورنگ آباد دکن میں رہتا تھا۔ شاہ نواز خاں کی پیدائش ۱۱۰۰ ہجری میں لاہور میں ہوئی۔ چونکہ ان کے اقربا اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ یہ اورنگ آباد لائے گئے۔

پہلے انھوں نے نظام آصف جاہ اول کی ملازمت اختیار کی۔ ناصر جنگ خلف نظام آصف جاہ کے دربار میں رسوخ پیدا کیا اور صوبہ برار کے دیوان مقرر ہوئے۔ جب ۱۱۵۰ھ میں آصف جاہ کی طلب دہلی میں قلمدان وزارت سپرد کرنے کو ہوئی تو وہ حکومت دکن اپنے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ کے حوالے کر کے دہلی روانہ ہو گئے۔ شاہ نواز خاں نے دربار ناصر جنگ میں پورا رسوخ حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ جب ۱۱۵۵ھ میں نظام آصف جاہ دہلی سے واپس آئے تو حکومت دکن کے لئے باپ بیٹے میں لڑائی شروع ہو گئی۔ ناصر جنگ نے حکومت دکن سے اپنے باپ آصف جاہ اول کو بے دخل کرنا چاہا۔ اس جنگ میں شاہ نواز خاں ناصر جنگ کی طرف سے میدان جنگ میں موجود تھے۔ ان کا ہاتھی ناصر جنگ کے ہاتھی کی پشت پر تھا۔

"نواب صمصام الدولہ بر فیل ردیف نواب نظام الدولہ بود" اس سے تین مطلب نکلتے ایک تو یہ کہ ناصر جنگ سمجھے کہ یہ میرے ساتھ ہیں۔ دوم ناصر جنگ کی پشت پر رہنے سے آصف جاہ کی آنکھیں ان پر نہ پڑیں سوم باپ بیٹے کی لڑائی میں جب پسری کی وجہ سے جان جانے کا خوف نہ رہے۔ چنانچہ جب اس معرکہ میں ناصر جنگ کو شکست ہوئی اور میدان جنگ سے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو عین میدان جنگ میں حزاللہ خاں نبیرۂ سعداللہ خاں (وزیر شاہجہاں) نے ازراہ خندگی شاہ نواز خاں سے پوچھا۔

"نظام الدولہ ناصر جنگ اینجا نزدیک می رود۔ شما کجا می روید"

ناصر جنگ تو اپنے باپ کے گھر جاتا ہے تم کہاں جاؤ گے" اس طنز سے شاہ نواز خاں کے کردار پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ جب ۱۱۵۵ھ میں وہ معاتب آصف جاہ

جوئے (دو کتاب مآثر الامرا) کی تصنیف شروع کی یہاں تک کہ ۱۱۶۰ھ میں یہ کام بند ہو گیا۔ [illegible]
آزاد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ نظام الدولہ کے عہد میں وہ مختلف عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے صلابت جنگ کے زمانے میں یعنی ۱۱۶۷ھ میں شاہ نواز خاں کو رفعت ہزاری کے منصب کے علاوہ صمصام الدولہ کا خطاب بھی حکومت نظام سے ملا اور ان کا ستارہ اقبال چمکا۔ وہ وکیل سلطنت دکن مقرر ہوئے۔
۱۱۶۹ھ میں جب بالاجی راؤ نے سانور کے افاغنہ سرداروں پر حملہ کیا تو شاہ نواز خاں نے افاغنہ کے خلاف بالاجی راؤ کی پوری پوری مدد کی۔
اسی زمانے میں فرانسیسی حکومت پانڈی چری کا اقتدار دربار نظام میں بڑھ رہا تھا۔ فرانسیسیوں کا بڑا مؤید خود ان کا پروردہ عبدالرحمن لمبی (سید جنگ) تھا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ شاہ نواز خاں گرفتار کیے گئے ان کا گھر بار لوٹ لیا گیا اور آخر جب نظام اصف جاہ دوم نے حیدر جنگ کو اپنے ساتھ دھوکے سے بلوا کے ذبح کرا دیا تو سید رجنگ کے ذبح ہونے کے چند گھنٹوں کے اندر فرانسیسیوں کے ملازم لچھمن نامی ایک ہندو نے قید خانے کے اندر شاہ نواز خاں کا معہ ان کے دو صاحب زادوں کے تلوار سے کام تمام کر دیا۔ غلام علی آزاد نے کئی موثر تاریخی رباعیاں کہی ہیں۔
آزاد کی تحریر "تنگ چشمی روزگار فرصت نہ داد" سے تشفی نہیں ہوتی ہے۔ شاہ نواز خاں نے نظام آصف جاہ اول اور نظام الدولہ خلف آصف جاہ کا مال غالباً اس لئے چھوڑ دیا ہوگا کہ خود اس میں ان کی تضحیک مضمر تھی جیسا کہ میں نے حزاھ اللہ کی کہی ہوئی عبارت میں پیش کر دیا "نظام الدولہ بخانۂ پدری رود شما کجا می روید"۔
ذوالفقار الدولہ نصرت جنگ جہاں جہاں اس کتاب میں امرائے ایرانی النسل (جن کا تعلق بہادر شاہ اول یا محمد شاہ سے تھا) کا ذکر آیا ہے تضحیک سے خالی نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھدی ہے جو تاریخ کے خلاف ہو یا اگر جو باتیں تاریخ کے خلاف نہیں ہیں انھیں اس طرح توڑ مروڑ کے بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس امیر جلیل الشان کے خلاف سراسر ہو گئی ہیں اور اس کے ہنر کی پردہ پوشی کرتی ہیں۔ مثلاً نصرت جنگ وزیر بہادر شاہ کے متعلق یہ تحریر ہے "گویند نصرت جنگ بدستاں سرائی و فریب طرازی رفیع الشان و جہاں شاہ را بہ تقسیم ملک راضی ساختہ با جہاندار شاہ یکجہت و یکدل گردانید و از ہر سہ اقرار وزارت بنام خود گرفت"
تاریخ مظفری یا سیر المتاخرین کو دیکھ جائیے کہیں بھی یہ الفاظ "دستاں سرائی و فریب طرازی" نہ ملیں گے بلکہ سیر المتاخرین کے مطابق "امیر ہے بہ جمیع فضائل و محاسن و اتصاف حمیدہ" ہے۔ غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین کا تعلق نہ دربار دہلی سے تھا نہ حکومت دکن سے۔ آگے چل کے تحریر کرتے ہیں "چوں مردم بہ سیرت ملوک مع طوائف ذوالفقار الدولہ خاں نیز بہ اختیار سبھا جند کھتری (کہ در شرارت و بد ذاتی یکتا بود) کار ہا گذاشتہ بعیش و عشرت پرداخت سہ در مجلسے چنیں شہر یارے چناں"
یہ صحیح ہے کہ جہاندار شاہ مرد لاابالی تھا۔ وہ لال کنور کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ خلوت ہو یا جلوت ہر جگہ لال کنور کی جلوہ گری تھی جب جلوس شاہی نکلا تو بھی لال کنور بادشاہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار تھی۔ مگر جو الفاظ شاہ نواز خاں نے ذوالفقار الدولہ کی شان میں استعمال کئے ہیں اس کی تصدیق کسی اور معتبر تاریخ سے نہیں ہوتی ہے۔
ذوالفقار الدولہ نصرت جنگ (محمد اسمٰعیل) یہ آصف الدولہ اسد خاں وزیر بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا اس کی ماں مہر النساء بیگم آصف خاں یمین الدولہ کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش ۱۰۶۷ھ میں ہوئی۔ مصرعہ تاریخ ہے سہ زِ بُرجِ اَسد رو نمود آفتاب
اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے عہد میں اس نے دکن میں بڑے بڑے منصب کے انجام دیئے تھے۔ مرہٹوں کو گویا نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس کے خوف سے راجہ رام خلف شیواجی بھاگا پھرتا تھا۔ بہادر شاہ کے مرنے کے بعد جب اس کے چاروں لڑکوں میں سلطنت کا جھگڑا شروع ہو گیا تو اس نے عظیم الشان کے خلاف تین بھائیوں جہاندار رفیع الشان اور جہاں شاہ کو متفق کر دیا۔ کیونکہ عظیم الشان (بانی عظیم آباد) صاحب ثروت و دولت و صاحب اقتدار تھا۔ عظیم الشان کی شکست ہوئی یہ واقعہ ۱۱۲۳ ہجری کا ہے ذوالفقار الدولہ کی پیدائش ۱۰۶۷ ہجری میں ہوئی۔ گویا ۱۱۲۳ھ میں اس کی عمر ۵۷ سال کی تھی اب اس پر بھی اگر یہ کہا جائے کہ "بہ عیش و عشرت پرداخت" تو یہ ریمارک کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔
اس کے برخلاف میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کتاب میں جہاں نظام الدولہ کا حال بیان کیا ہے۔ تعریف کا دریا بہا دیا ہے۔
نظام الدولہ ناصر جنگ "میرے بود دیندار و کرم گستر غیور صاحب عزم صف آرائے بزم و رزم۔ احکام شریعت غرا جہد و افی می نمود و در فریاد رسی عاجز و نالاں بے دست و پا توجہ تام می فرمود۔ در فصاحت تقریر و ادراک لطائف سخن کہ کس یکتائی می نواخت غرض امیر نہ ہوئے خلیفہ وقت۔ باپ کے

خلاف تلوار اٹھانا اور بغاوت کرنا شاید احکام شریعت میں داخل نہیں ہے وہ بھی ایسے باپ کے خلاف جس نے حکومت دکن بطور امانت دولت آصفیہ ایسے نازک وقت میں سپرد کر دی ہو۔

میر میراں امیر خاں اسی طرح امیر خاں میر میراں صوبہ دار کابل کے متعلق صفحہ ۲۹۶ ماثر الامرا مطبوعہ کلکتہ پریس میں تحریر ہے "بالجملہ امیر خاں مذکور صاحب جی فرزند نہ شد اچوں او برخان مزبور سخت غالب بود، ند کمال، خفا، خواہا نگاہ داشتہ اولاد بسیار بہم رسانید" مدخولہ کے معنی ہوئے داشتہ حقیقت یوں ہے کہ جب صاحب جی کے بطن سے امیر خاں کو کوئی اولاد نہیں ہوئی تو صاحب جی کی مرضی سے انہوں نے دہلی کے ایک معزز خاندان میں عقد ثانی کیا۔ ان ہندوستانی بیوی کے بطن سے نواب امیر خاں انجام پیدا ہوئے۔ جہاں امیر خاں انجام کا ذکر کیا گیا ہے اس بات کو قطعی فراموش کر دیا گیا۔

وہ زمانہ عالمگیر اورنگ زیب کا تھا جو سلطنت کے گوشے گوشے کی خبر رکھتا تھا۔ مرشد قلی جعفر خاں ناظم بہار و بنگال وارثیہ نے ایک دفعہ اورنگ زیب کے پاس عظیم الشان (اورنگ زیب کے پوتے) کی شکایت لکھ بھیجی اس زمانے میں عظیم الشان نائب ناظم بہار تھا فوراً عتاب شاہی نازل ہوا کہ آئندہ سے اگر ایسی شکایت پھر سنی گئی تو بابہ جولاں دہلی لایا جائے گا اور تبر د شہزادگی کا خیال نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ خط رقعات عالمگیری میں موجود ہے۔ جس عہد میں شاہزادوں کی ایسی حالت ہو وہاں ایک سرحد کے ایسے شورش افزا صوبہ دار کی کیا مجال تھی کہ مدخولہ رکھتا وہ بھی اس صورت میں کہ صاحب جی جیسی بیوی نہ صرف صوبہ دار پر حاوی ہو بلکہ امور حکومت پر بھی۔

چونکہ صفدر جنگ نواب اودھ اور امیر خاں انجام سے غایت درجہ کی دوستی تھی اور دونوں نے مل کے درانی پارٹی کو نیچا دکھایا تھا اسی وجہ سے صاحب ماثر الامرا نے ایک غلط روایت جوڑ دی۔ امیر خاں انجام کے متعلق خود ماثر الامرا کی تحریر بلا خطہ ہو "وحسب الغرض او صفدر جنگ ناظم اودھ (کہ ابتدا ہر دو اخلاص بسیار متحقق بود) طلب حضور شدہ بہ داروغگی توپ خانہ اختصاص گرفت و ہر دو متفق شدہ فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) را بر سر علی محمد خاں روہیلہ بردند۔ اما بہ سبب نفاق اعتماد الدولہ قمر الدین خاں پیش رفت نشد۔ در ایں ایام بر زبان خاص و عام بود کہ وزارت بارمی شود" جب ایسا تھا تو عماد الملک (نظام آصف جاہ اول کے پوتے) نے کیوں عہدہ وذات کو قبول کیا اور صرف وزارت حاصل کرنے کے لئے دکن سے مرہٹوں کو بلوایا۔ یہاں تک کہ سکندر آباد خالصہ شاہی کو بھی ہولکر کے حوالے کر دیا۔

ہولکر آمدہ بے منازعت تمام اثاثۂ سلطنت را غارت کرد مگر زنانیہ (دختر فرخ سیر بادشاہ) کہ زوجہ فردوس آرام گاہ بود دد گریبہ دگیاں سر اوقات پادشاہی با سر در آمدند ہولکر اینہا را بہ حرمت نگاہ داشت" جہاں تک حرمت و مستورات کا سوال ہے تاریخوں میں یہ واقعہ طور سے درج ہے کہ ہولکر نے انیس دہلی لاکر خواص پورے میں رکھدیا تھا۔ اس بات کی شاہ نواز خاں نے پردہ پوشی کی ہے یہ وہی شاہ نواز خاں ہے جنھوں نے نظام کی فوجوں کو بالاجی راؤ کی مدد کے لئے اغتشاش سانولہ کے خلاف بھیجا تھا۔ مرہٹے طبعی اخیر کے سلاطین مغلیہ کی حرمت کرتے تھے وہ وقائع عالم شاہی سے ظاہر ہے۔ پردہ پوشی تو درکنار، عماد الملک کے حال میں ماثر الامرا میں یہ درج ہے کہ ہولکر نے بغیر عماد الملک کی مرضی اور اطلاع کے سکندر آباد پر حملہ کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ بات تاریخ کے خلاف ہے۔

اس تاریخی فروگذاشت کا احساس خود میر عبد الحی خاں کو بھی تھا۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"اسید از مطالعہ کنندگان ایں کتاب آنست کہ اگر سہوے یا خطائے بہ نظر آید در اصلاح کوشند و بہ نظر عیب پوشش پوشند" عیب پوشی بہترین صفت ہے مگر اس صورت میں جب کسی کی تضحیک و توہین نہ کی جائے۔ میر میراں کے حال میں "مدخولہ" کا ذکر کر دیا مگر امیر خاں انجام کے حال میں اس کو واضح نہ کیا۔ اس سے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

سعادت علی خاں برہان الملک یہ صفدر جنگ کے حقیقی ماموں تھے اور جسر بھی۔ چنانچہ وقائع عالم شاہی میں مولانا عرشی کی تحریر بلا خطہ ہو "ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ (۱۰ مارچ ۱۷۳۹ء) میں برہان الملک کا انتقال ہوا تو محمد شاہ بادشاہ نے ان کے صغیر السن بیٹے کو صوبہ دار مقرر کر کے صفدر جنگ کو بدستور نائب اور متولی امور حکومت رکھا۔ اس کی خوش قسمتی سے وہ بچہ مر گیا اور یہ بالاستقلال صوبہ دار بنایا گیا مگر اس عہدے کے حاصل کرنے کی غرض سے نادر شاہ کو دو کروڑ روپے کی رشوت دینا پڑی" وقائع عالم شاہی مطبوعہ اسپور صفحہ ۱۷۳)

مآثرالامرا صفحہ ۴۶۶ مطبوعہ کلکتہ پریس ۱۸۸۵ء میں تحریر ہے "پسرے ازو (برہان الملک) نماند صیغہ اولاد ابوالمنصور خاں منسوب بود۔ مآثرالامرا کے مطابق گویا برہان الملک کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی جو سراسر تاریخ کے خلاف ہے۔ مآثرالامرا کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تین شخصوں کے بعد مرتب اثر علی پروفیسر عربی و فارسی پریذیڈنسی کالج کلکتہ نے اس میں مزید تصحیح و تالیف کر دی ہے۔ گویا بجائے تین چار مؤلف ہو گئے۔

نواب لطف اللہ خاں صادق مآثرالامرا کی تحریر ہے "از شیخ زادہائے انصاری۔ دلش پانی پت است۔ وقتیکہ خلد منزل عزم دربار پادشاہی آمد در رفت نمود از کم رتبگی بہ پایہ عمدگی رسید۔ خلد منزل سے مراد بہادر شاہ اول اتنی سی عبارت میں ابتدائے اسلام سے زوال سلطنت مغلیہ تک کی تاریخ پوشیدہ ہے بجائے شیخ زادہائے انصاری یوں بھی تحریر کیا جا سکتا تھا کہ از اولاد حضرت ایوب انصاریؓ۔ لطف اللہ خاں صادق کے دوسرے بیٹے شاکر خاں اپنی تالیف گلشن صادق میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ایوب انصاری کے صاحب زادے حضرت ابومنصور نے جناب خلیفہ ثالثؓ کے عہد میں بڑے معرکے انجام دیے ان کا شمار اولیائے دولت اسلامیہ میں ہے انھوں نے ہرات میں اقامت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ ابومنصور کی ساتویں پشت میں شیخ الاسلام حضرت ابواسمٰعیل خواجہ عبداللہ انصاری ہوئے، جنھوں نے نظام الملک طوسی کے عہد میں علوم دینیات و فقہ و فقر و غنا میں کافی نام پیدا کیا تھا۔ انھوں نے جو چند کلمات نظام الملک طوسی کو بطور نصیحت کہے تھے حسب ذیل ہیں "در رعایت دلہا کوش و عیب مردم بپوش و دین و دنیا مغروش۔ با نظام ہر کہ وہ خصلت شعار خود سازد و در دنیا و اخرت کار خود سازد..... وغیرہ وغیرہ"

شیخ الاسلام ابواسمٰعیل کی ساتویں پشت میں محمد امیر شیخ ابواسحاق ہوئے جو بادشاہ شیراز تھے۔ ان کا زمانہ وہی تھا جو حافظ شیرازی کا چنانچہ حافظ شیرازی ایک قصیدے میں ان کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

خدائگانِ سلاطین مغرب و مشرق — خدیو کشور عفو و کرم باستحقاق
سپہر علم و حیا آفتاب جاہ و جلال — جمال دنیا و دیں شاہ ابواسحاق

ابواسحاق کے بعد گیارہ پشتیں ایران میں گذریں۔ آخر خواجہ ملک علی سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے۔ غیاث الدین بلبن نے انھیں مناسب عہدہ دیا۔ عہد شاہ جہاں میں اسی خاندان کے بزرگ خواجہ عبدالرزاق کو میر عبداللہ مشکیں رقم استاد بادشاہ نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ نے چہار ہزاری منصب عطا کیا اور کچھ دنوں کے بعد انھیں گورکھپور کی صوبہ داری پر فائز کیا۔ خواجہ عبدالرزاق نے گورکھپور کے سرکش زمینداروں کو سر کیا اور غنیم کا قلع قمع کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انھیں گڑھ توڑ کا خطاب ملا۔ شاہ جہاں کے عہد میں عربی کے مناسب الفاظ کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا تھا چنانچہ یہ لفظ گڑھ توڑ ترجمہ ہے عربی کے لفظ ہادم القلاع کا۔ عبدالرزاق خاں کے تین صاحب زادے دلیر دل خاں لطف اللہ خاں صادق اور شیر افگن خاں۔ سب کے سب اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔

دلیر دل خاں عہد عالمگیر میں دیوانی و بیرسالی و بخشی گیری کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہاں تک کہ عہد محمد شاہ میں ملتان۔ ٹھٹہ اور لاہور کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے "معین الدولہ نصیر جنگ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ انھی کی بیٹی صاحب زادی کی شادی جمیل الدین ابن لطف اللہ خاں صادق سے ہوئی تھی (گلشن صادق)

شیر افگن خاں عبدالرزاق خاں کے تیسرے صاحب زادے تھے۔ عہد محمد شاہ میں ہفت ہزاری کا منصب پایا۔ مالوہ ملتان اور کڑہ الہ آباد کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے عزت الدولہ بہادر صفدر جنگ کا خطاب بھی دیا تھا۔ مآثرالامرا کی تحریر ہے "دلیر دل خاں برادر است کہ ہمراہ ابرارالامرا بود منصب سہ ہزاری رسیدہ و برادر سوم او شیر افگن خاں است کہ بہ فوجداری کڑہ مصاف الہ آباد سرافراز شدہ۔ از پسرانش (لطف اللہ خاں) عنایت خاں رسمیح و شاکر خاں بقدر ترقی کردند"

نواب جعفر خاں راغب نبیرہ عنایت خاں راسخ اپنی تالیف "گلزار جعفری" (مجموعہ خطوطِ فارسی میرزا ناخر تکمین) میں تحریر فرماتے ہیں "محمد جعفر خاں المتخلص براغب ابن ہدایت اللہ خاں مرحوم نبیرہ شمس الدولہ لطف اللہ خاں صادق و نبیرہ عزت الدولہ شیر افگن خاں" گویا شجرہ نسب یوں ہوا۔

عبدالرزاق خاں گڑھ توڑ

دلیر دل	لطف اللہ خاں صادق	شیر افگن
	شاکر خاں	ذاکر ہدایت اللہ خاں
	عنایت خاں راسخ ہدایت اللہ خاں	

جعفر خاں راغب
مہدی علی خاں

جلال الدین حسین خاں ناظم — عارفہ بیگم
مادر شاہ عظیم آبادی

جعفر خاں راغب

لاولد

جب محمد شاہ نے قطب الملک عبید اللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خاں کو کہ پھینکنا چاہا تو شیر افگن خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا (عام مورخ عبید اللہ خاں کا صحبہ اللہ خاں لکھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ قطب الملک عبید اللہ خاں کے والد کا نام عبد اللہ خاں تھا جن کے کئی صاحب زادے تھے۔ عبید اللہ خاں۔ سید حسین علی خاں، سید نجم الدین حسین خاں، سید زین الدین حسین خاں عرف میر زینا)

کہتے ہیں کہ عین لڑائی میں جب سید نجم الدین حسین خاں کا ہاتھی شیر افگن خاں کے ہاتھی کے سامنے آیا تو شیر افگن خاں نے ایک تیر ایسا تاک کے چلایا کہ نجم الدین حسین خاں کی آنکھیں جاتی رہیں۔ شیر افگن خاں نے عین حالت اضطراب میں آگے بڑھ کے اپنا ہاتھی نجم الدین خاں کے ہاتھی سے ملا دیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی کی۔ سید نجم الدین حسین خاں نے ہاتھ بڑھا دیا اور شیر افگن خاں ان کے ہاتھی پر سوار ہو کے انھیں عین میدان جنگ سے بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔ بادشاہ کو رحم آگیا اور انھیں شیر افگن خاں کے حوالے کر دیا۔ شاکر خاں نے تفصیل سے اس واقعہ کو گلشن صادق میں لکھا ہے گلشن صادق کا قلمی نسخہ خدا بخش خاں مرحوم کی لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ۱۱۴۳ھ میں شیر افگن خاں نے بعارضہ سرسام رحلت کی۔

لطف اللہ خاں صادق خواجہ عبد الرزاق کے منجھلے بیٹے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں محمد معظم شاہ بہادر شاہ اول کے بیٹے جہاں شاہ کے اتالیق تھے اور بخشی۔ اس کے بعد شہزادے کے مدار علیہ مقرر ہوئے۔ جہاں شاہ نے یہ تحریر اپنے ہاتھوں سے لکھ دی تھی "ارادت مند صادق فیروز خواہ لائق لطف خاں صادق موفق بہ توفیقات حسنہ بود، بداند کہ آں سعادت مند صفحہ طلب نمودہ کہ مشتمل بہ رضا مندی خود نوشتہ دادہ شود۔ بنابراں کلمہ چند نوشتہ شد تا شود یا صادق الحمد کہ او سلم صادق است"۔

چند سطروں کے بعد شاہزادے جہاں شاہ نے یہ قطعہ لکھا ہے ؎

یاد روزے کہ بعد مادن تو — ہمہ خنداں شدند و تو گریاں
ہم چناں زی کہ بعد مردن تو — ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

جب بہادر شاہ اول نے اپنے بھائیوں پر فتح پائی تو وزارت کا سوال پیدا ہوا۔ وہ منعم خاں خانخاناں کو وزارت کا عہدہ دینا چاہتا تھا مگر اسد خاں آصف الدولہ (پدر ذوالفقار الدولہ) نے اپنے حقوق کو بادشاہ پر ظاہر کر دیا۔ وہ عالمگیر کے عہد میں وزیر رہ چکا تھا۔ تدبر و بد کے عالم میں بادشاہ نے جہاں شاہ کے مدار علیہ لطف اللہ خاں صادق سے استفسار کیا اور لطف اللہ خاں نے اسد خاں کے حق میں رائے دی۔ بادشاہ خوش ہو گیا اور اس نے ان کو خان صادق کا خطاب مرحمت کیا۔ علم و نقارہ سپرد کیا۔ اسی واقعہ کو صاحب مآثر الامرا نے یوں مختصراً لکھا ہے "در لقب او کہ لفظ صادق افزودند وجہ آں زبان زد عوام است"

بہادر شاہ اول کے مرنے کے بعد حصول اقتدار کے لئے اس کے چاروں لڑکوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ کی لاش بے گور و کفن ایک ماہ تک کس مپرسی میں پڑی رہی۔ عظیم الشان متمول اور صاحب اقتدار تھا۔ وہ عظیم آباد کا بانی تھا اور دہلی ہی کی طرح اس نے اپنے عہد نظامت بہار میں پٹنہ کے محلوں کے نام نئل پور، دیوان محلہ، گذری، توان شکوہ وغیرہ رکھا تھا۔ ذوالفقار الدولہ نے عظیم الشان کی قوت و ثروت دیکھ کے تینوں شاہزادوں، جہاندار شاہ رفیع الشان اور جہاں شاہ کو آپس میں لڑا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عظیم الشان کی شکست ہوئی لطف اللہ خاں صادق اس معرکہ میں جہاں شاہ کی طرف تھے۔ مگر جب سلطنت کے تقسیم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو جہاندار شاہ نے نہ چاہا۔ پھر دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ جہاں شاہ نے مختصر سے لشکر سے حملہ کر دیا بقول مآثر الامرا "جہاں شاہ در عین معرکہ با قلیلے از لشکر گاہ خود را بر قول معز الدین زدہ متفرق ساخت خود لال کنور۔ معتوقہ جہاندار شاہ (کہ بے او آنے بسر نمی برد) بر اگندہ بہ لاہور گریخت و جہاندار شاہ خود را بہ پناہ پیر اد ھا کشید۔ نقارہائے فتح جہاں شاہ بہ نوازش در آمد۔ چنانچہ بہ ہمیں خبر دہلی و در دست خطبہ او خواندند کہ ناگاہ تفنگے بہ جہاں شاہ رسیدہ در گذشت۔ ذوالفقار الدولہ (کہ در ہر اول بہ جنگ توپ و تفنگ اشتغال داشت) مطلع شدہ، برفوجش تاختہ منہزم ....."۔

یہ نواب افتخار خاں کے حال میں تحریر ہے مگر اس میں لطف اللہ خاں صادق کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ اس معرکہ کا لطف اللہ خاں صادق کے حال میں ذکر ہے۔ ارادت خاں بن کفایت خاں جو اس معرکہ میں شریک تھے تحریر کرتے ہیں۔

"دراں اثنا دزگیر و دار خاں صادق راتق و فاتق مدار علیہ حلہ کارہائے آں شاہزادہ تہور شعار بود تا رمقے از حیات شاہزادہ باقی بود بہ ایں کہ ہمراہیاں برخے مقتول و مجروح برتے سفر در شدن، خان مرحوم رو از عرصہ کارزار نہ پیچید"۔

بہادر شاہ نے کچھ سمجھ کے خان صادق کا خطاب عطا کیا تھا۔ سچے دیندار مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرخ سیر کے عہد میں ایک واقعہ اور ہوا تھا جس کا ذکر مآثر الامرا اور تاریخ مظفری دونوں میں ہے۔

"قطب الملک دیوانی خالصہ بنام او (لطف اللہ خاں) تجویز نمودہ بادشاہ وی تعلقہ بنام چھیلہ رام ناگر مقرر کردہ بود۔ بدیں تقریب ابین بادشاہ و خنیدگی مدت واقع شد۔ قطب الملک گفت کہ پرگنہ تجویز اول و زر پذیرائی استقلال او معلوم۔ آخر تعلقہ مزبور بنام خان مسطور بحال یافت"

یہ واقعہ صحیح ہے مگر سید علی اور بادشاہ کے درمیان میں کدورت کا سب سے بڑا سبب فرخ سیر کی بدزبانی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ کم سن اور ناتجربہ کار اور آداب شاہی کے خلاف حرکتیں کر جاتا تھا چنانچہ بقول صاحب سیر المتاخرین و صاحب تاسیخ مظفری فرخ سیر نے دونوں بھائیوں کو بھرے دربار میں گالیاں دیں۔ تذکرۃ الاسلاف مولفہ شاد عظیم آبادی میں دونوں تاریخوں کے حوالے سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"امیر الامرا و قطب الملک مازبرائے اتمام حجت چنانکہ بارہا اتفاق افتادہ بود پیش فرخ سیر رفتہ پیغام دند۔ در جواب نصائح سودمند نواب امیر الامرا معتوب قطب الملک را دشنام مغلظہ بر زبان راند، امیر الامرا کہ شجاعت بے نہایت و غیرت بدرجہ غایت داشت تاب نہ آوردہ خواست کہ تادیب آں دیو دہن دریدہ بے باک کہ پاس حرمت اہل اطہر سید البشر ہم نداشتہ بفرماید۔ اما فرخ سیر از سریر سلطنت گریختہ پناہ در نسوان حرم خود برد"

یہ صحیح ہے کہ جھگڑے کی ابتدا دیوانی خالصہ سے ہوئی مگر فرخ سیر کی معزولی کی وجہ درحقیقت اس کی بدزبانی تھی۔ پھر کوئی دوسری ایسی مثال نہیں ہے کہ ان دونوں نے کسی اور بادشاہ کو تخت پر بٹھا کے اتارا ہو۔ رفیع الدرجات اور رفیع اللہ اپنی موت سے مر گئے۔ محمد شاہ نے پارٹی سے سازش کر کے ان دونوں کو ختم کر دیا۔ اس کے برخلاف عماد الملک نے جو تین بادشاہوں کے ساتھ سلوک کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ تورانی پارٹی جب برسر اقتدار آئی تو عماد الملک کے عہد وزارت میں صاحب مآثر الامرا شاہ نواز خاں کو دہلی سے دکن میں ہی دمراتب بھیجے گئے۔ بقول غلام علی آزاد:

"دریں ایام سلطان دہلی عالم گیر ثانی برائے نواب صمصام الدولہ اہی دمراتب فرستاد۔ شخصے ایں مصرعہ تاریخ یافت ؎ لذ شاہ ہند آمد ما ہی دیم مراتب"

یہ وہ زمانہ تھا جب عماد الملک بادشاہ گر بنا ہوا تھا۔ ۱۱۶۷ھ میں اس نے احمد شاہ کو نابینا کرا دیا۔ اس کی ماں (رحیم بائی کے خسر) اور آخر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے عالمگیر ثانی کو قید سے باہر کر کے تخت پر شل مسطرنج بٹھا دیا۔ شاہزادہ عالی گوہر اس کے خوف سے بھاگ نکلا اور الہ آباد دبہار میں آوارہ پھرنے لگا۔ شاہ عالم کے اس زمانے کے حالات پر میرزا فاخر مکین کے فارسی کے خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔

میرزا فاخر مکین کے خطوط کا مجموعہ ان کے عزیز ترین شاگرد نواب جعفر خاں راغب نے گلزار جعفری کے نام سے مرتب کیا ہے اور اس کا اصلی مسودہ راقم الحروف کے پاس اس وقت تک محفوظ ہے چونکہ اس کے خاندان کی چیز ہے۔ اس میں زیادہ تر خطوط نواب جعفر خاں راغب (لطف اللہ خاں صادق کے پر پوتے اور عنایت خاں راسخ کے پوتے) کے نام ہیں۔ ایک خط محمد علی خاں مرحوم مصنف تاریخ جعفری و محمدی برادر عمی نواب جعفر خاں راغب کے نام کا ہے۔ فاخر کے اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ مظفری کا خطبہ فاخر مکین کا لکھا ہوا ہے۔

"بہ تقریب ارسال مسودہ خطبہ تالیف خطے کہ نوشتہ اند محفوظ ساختہ الہی چوں بہ سایۂ بزرگاں دیرگاہ بہ سلامت باشند۔ بارے غنیمت است کہ بہ خلاف نوجوانان عصر بیکاری را با شغال کتب صرف می کنید۔ تذ ہزار وقت افسوس کہ عمر با بہ غفلت برباد دادیم۔ حالانکہ نزدیک پیری رسیدیم چوں بخود نظر کشادیم ہماں آخر پارینہ کہ بودیم خود را دیدیم۔ دریغا حسرتا ؎

عمر آخر شد و الکارہ آدم نشدیم گرچہ سودا ست قضا ایں ہمہ سوہاں ما را

شما کہ بفضل کرمہ جوانید قدر عمر و جوانی بدانید ؎

جواناں رہ طاعت امروز گیر کہ فردا جوانی نہ آید ز پیر"

چند سطروں کے بعد "مسودہ دیدہ و نجیدہ مرسل خند زیادہ شوق"

تاریخ مظفری کا سن تصنیف ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء ہے۔ چنانچہ خاتمہ کمیں کا یہ خط بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ جعفر خاں راغب نے جو رباعی "گلزار جعفری" کے متعلق کہی ہے حسب ذیل ہے ؎

ایں نسخہ کہ رنگینیٔ اتمام گرفت، صد شکر بہ لخواہ سرانجام گرفت
بشگفت چوں راغب ایں گل باغ مراد صد برگ و نوا گشت ایام گرفت

اسی گلزار جعفری میں "میرزا خاتمہ کمیں نے میرزا سودا سے .... اپنے جھگڑے کا ذکر لپٹے لپٹے لفظوں میں کیا ہے۔ اس مختصر سے واقعہ کو لے کر صاحب آب حیات نے ایک افسانہ تراشا ہے۔ انشاء اللہ کبھی آئندہ اس پر تفصیل سے مقالہ پیش کیا جائے گا۔ سودا کے متعلق جو خاتمہ کمیں نے ایک طویل غزل لکھی ہے وہ ایک دوسرے خط میں موجود ہے۔ میں صرف دو شعر پیش کر دیتا ہوں ؎

نہ دید از خود فروشی دشمن اجنس بہبودی۔ بہ بازار جہاں وارد جنس سودائے بے سودی
نہ دارد گر چہ از آہ محرومی دم دوری بہ ایں بے مائگی جوش خریداراں ملیح (پڑھا نہیں گیا)

الغرض لطف اللہ خاں صادق ایسے تھے کہ ان کی اولاد نے ایسی ایسی نادر کتابیں "گلشن صادق" "تاریخ مظفری" "گلزار جعفری" اور کلام شاد عظیم آبادی چھوڑیں ہیں۔ جب احمد شاہ کے عہد میں تورانی پارٹی برسر اقتدار آئی تو لطف اللہ خاں صادق نے عہدہ خان سامانی اور منصب ہفت ہزاری کو ترک کیا اور خانہ نشیں ہو گئے۔ ان کے صاحب زادے عنایت خاں راسخ نے بھی یہی کیا اور سہ ہزاری کے منصب کو ترک کیا۔

خان صادق نے ۱۱۵۵ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں اپنی حویلی جو دہلی میں کشمیری دروازے کے متصل تھی قضا کی۔ حسب وصیت لاش پانی پت لائی گئی۔ قطعہ تاریخ رحلت یہ ہے ؎

خان صادق کہ بجز چند امیران زماں بہتر از جملہ بہ توقیر دامانت آمد
بے سر و صف بگو واقعۂ رحلت او نائب سلطنت سند بہ جنت آمد ۱۱۵۵ھ

خان صادق فقراء و مساکین پر اس قدر بے دریغ خرچ کرتے تھے کہ ایک دفعہ فرخ سیر بادشاہ نے خود ان سے پوچھا تھا خان صادق شما از برائے عیال ہم چیزے میگذارید یا ہمہ را خرچ سا خرین و امور خیر میکنید۔" گلشن صادق تذکرۃ الاسلاف۔

غرض ایسے باکمال زاہد و دین دار امیر کے متعلق آپ نے مآثر الامرا کی تحریر لکھ لی۔ اس سے مولف کی تنگ نظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے خان صادق کو شعر و شاعری میں بھی دخل تھا۔ چنانچہ ایک خط میں دو اشعار جو انھوں نے برہان الملک سعادت علی خاں صوبہ دار اودھ کو لکھ بھیجے تھے لاحظہ ہوں ؎

گہے چو شانہ بہ زلف سیاہ می پیچم گہے چو سرمہ بہ پائے نگاہ می پیچم
چناں بہ دیدن روئے خوش تو شاتم کہ نامہ را بہ حریر نگاہ می پیچم

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے
پھر پھر گل آ چکے، پہ سجن تم بھلے گئے

سودا

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا
سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لنن
شنٹون

کپڑا
سلکی بلینن

جورجٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون نائلن
نئون

کپڑا
اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پانامہ
پرشیا

ان کے علاوہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ جی۔ ٹی روڈ امرتسر

ٹیلی فون 2562 تار کا پتہ :- "رین" (RAYON)

اسٹاکسٹ :-

ٹراونکور رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا و رمومی (سیلوفین) کاغذ

نوابؔ مرزا نامؔ علی خاں رعنا

بحیثیت شاعر اور انشا پرداز

امیر حسن نورانی

رعنا غالب کے شاگرد رشید تھے اور ان کو اس پر فخر و ناز تھا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں کیا ہے۔ خود غالب بھی ان کے مداح تھے۔ اسی لیے بعض تحریروں میں رعنا کا ذکر تحسین آمیز انداز میں کیا ہے۔ جب ان کو رعنا کی بہادری اور جرأت کا ایک واقعہ معلوم ہوا تو اس کے متعلق اودھ اخبار میں ایک مختصر مضمون لکھا۔ جو ماہ اکتوبر ۱۸۶۲ء کے ایک شمارے میں شایع ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو رعنا سے خصوصی لگاؤ تھا۔[1] ایک شعر میں رعنا نے غالب کی شاگردی کا اظہار اس طرح کیا ہے:

طالبِ اسد اللہ کا غالب کا ہوں شاگرد — بہ جرأت مجھے بے واسطہ ہے شیر خدا سے

رعنا کے حالات زندگی "تلامذۂ غالب" میں تفصیل سے موجود ہیں چند مضامین بھی ان کے حالات اور شاعری پر شایع ہوئے ہیں مگر ان میں کوئی ایسا اضافہ نظر نہیں آیا جو "تلامذۂ غالب" کے علاوہ ہو۔ اسی لیے مناسب نہیں معلوم ہوا کہ ان کے حالات زندگی کو یہاں نقل کیا جائے۔ سطور ذیل میں رعنا کے متعلق ایسی معلومات پیش کرنا مقصود ہے جو اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ عام طور پر ان کو ایک شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اور چوں کہ وہ مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے اس لیے تلامذۂ غالب کے زمرہ میں شامل ہونا ہی ان کی شہرت کا سبب خیال کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رعنا صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک اچھے مضمون نگار بھی تھے۔ جو ہر قسم کے علمی ادبی، اصلاحی، سیاسی اور معاشرتی عنوانات پر قلم برداشتہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جنوری ۱۸۶۳ء سے نومبر ۱۸۶۳ء تک ان کے تقریباً پچاس مضامین اور دس بارہ مراسلے اودھ اخبار میں شایع ہوئے۔ اس وقت اخبار مذکور ہفتہ وار شایع ہوتا تھا۔ بعض شماروں میں رعنا کے دو دو مضامین شایع ہوئے۔ ان میں کچھ تو معمولی قسم کے ہیں لیکن بعض قابل قدر ہیں اور علمی و فنی نقطۂ نظر سے اچھے خاصے معیاری ہیں۔ رعنا کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ملک کے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی حالات سے پورے طور پر باخبر رہتے تھے۔ اور اکثر معاملات اور مسائل پر آزادی سے اظہار خیال کرتے تھے۔ علمی و ادبی حلقوں میں بھی ان کی قدر و منزلت تھی، لاہور کے ایک شاعر دیوان امرناتھ متخلص بہ اکبری سے ان کی بڑی چشمک تھی اور غالباً اس کا آغاز اسی زمانہ سے ہوا تھا جب رعنا کا قیام سلسلۂ ملازمت پنجاب میں رہا تھا۔ اکبری کی غزلیں، قصائد اور مضامین کوہ نور اخبار لاہور میں شایع ہوتے تھے۔ رعنا کا کلام بھی کوہ نور میں شایع ہوتا تھا رعنا نے اکبری کے کلام پر تنقید کی ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اور اسی طرح اکبری بھی کرتے تھے۔ دونوں میں بڑی نوک جھونک رہتی تھی۔ اکبری لاہور کے ایک معزز اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا علم رعنا کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ اودھ اخبار میں تین نہایت طویل تنقیدی مضامین رعنا نے اکبری کے کلام پر لکھے ہیں اور ان کے اعتراضات کے جواب دیئے ہیں۔ چند مضامین ایسے عنوانات پر ہیں جن پر کم لوگوں نے لکھا ہوگا۔ مثلاً فرقہ مخنثان کی تاریخ، ارتقا اور ان کی معاشرت پر ایک مفصل مضمون ہے۔ اس طرح ایک مضمون "انسداد مخنث فرقہ ملعونہ طوائف" کے عنوان سے لکھا ہے۔ رعنا کو نجوم اور مسمریزم سے بہت دلچسپی تھی اور ان دونوں میں مہارت بھی رکھتے تھے۔ متعدد مضامین ان علوم پر بھی لکھے ہیں۔

---

[1] مرزا غالب کا یہ مضمون میں نے مختصر تعارف اور حوالوں کے ساتھ مرتب کیا تھا جو اردو ادب (علی گڑھ) میں شایع ہو چکا ہے (امیر حسن نورانی)

تنقیدی مضامین میں اچھی خاصی موشگافیاں نظر آتی ہیں۔ انداز تنقید متوازن نہیں۔ کہیں کہیں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی عامیانہ سطح پر اتر آتے ہیں کہ تنقید سراپا تنقیص بن جاتی ہے۔ تاہم ان مضامین کو اردو میں تنقید کے ابتدائی دور کی مبادیات کہا جائے تو بے نہ ہوگا۔

رعنا کبھی متقفیٰ، سجع عبارتیں بھی لکھا کرتے تھے۔ "گلدستۂ رعنا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انگریزی اقتدار سے قبل ملک کی ابتری اور انتشار کا ذکر استعارہ و کنایہ میں کیا ہے اور انگریزی دور کی خوش انتظامی، امن و سکون کو سراہا ہے۔ اس مضمون کی چند سطور درج ذیل ہیں:۔

ایک باغ سو برس آگے تاج خزاں تھا۔ نام کو باغی اس کا نام و نشان تھا۔ گروہ یارانِ طریقت کا خراماں خراماں اس پر گزر ہوا۔ اہتمام اس کا مدنظر ہوا۔ جب عملہ اس پر معمور ہوا۔ نام ظلمت خواں کا صاف کافور ہوا۔ سعیٔ باغبان سے رفتہ رفتہ رشک رضوان ہوا۔ خار و خس تک پھول پھول سنبلستاں ہوا۔ رشک آب، روانی نہر و آب جوئے کو تر و تسنیم کو پانی کیا۔ صفا و راستی نے ہر روش کو صاف صحا کہکشانی کیا غارستان سواد باغ تک سبزۂ بیگانہ نہ ہوا۔

مرغان چمن طائرِ سدرہ کے ہم صفیر تھے۔ بجز باد صبا کے صرصر کا وہاں کام نہ تھا صیاد و گل چین کا نام نہ تھا۔ پر باغبان نے ایک عمر چین سے بسر کی۔ یارانِ طریقت نے دن گلگشت میں کاٹا۔ رات عیش میں سحر کی۔ نہ گل کو گل چین کا خوف و بیم تھا۔ نہ کسی مرغ چمن کا جور و ترس صیاد سے دل دو نیم تھا۔ پھول پھولے نہ سماتے تھے۔ شاخ پر ثمر شاخ سدرہ کے ہمسر زمین پر بچھے جاتے تھے۔ خاک سرزمین چمن خاک شفا تھی رفعت میں پرکوشک عرش سے بالا تھی.....

عام طور سے رعنا صاف، سادہ زبان میں لکھا کرتے تھے۔ محاورات و ضرب الامثال کا برمحل استعمال ان کو خوب آتا تھا۔ طنز و مزاح کی چاشنی بھی ان کی تحریروں میں موجود ہے تاہم وہ کوئی صاحب طرز انشا پرداز نہیں کہے جا سکتے لیکن اردو زبان کے ایک اچھے ادیب ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کا ایک مضمون ہے "تکیہ کلام" اس کی چند سطریں پڑھیے:

"تکیۂ کلام ہزاروں طرح کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا جدا تکیۂ کلام ہے" جیے، کیا نام، ہاں صاحب، سمجھے صاحب، آیا خیال، پہرنی، اس کا کیا نام ہے، صاحب میرے، محض لوگوں کا تکیۂ کلام الفاظ ثقیلہ ہو جاتے ہیں۔ اور افسوس ہے" (ص ۳۰)

کہ وہ لوگ کیسے بھلے مانس ہیں کہ کسی بھلے مانس کی صحبت میں بیٹھنے کے لایق نہیں۔ (اودھ اخبار، ۷ مئی ۶۲)

رعنا کو چھوٹے چھوٹے نئے اور شگفتہ نام رکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ ان کی عادت ہو گئی تھی کہ ہر مضمون کے خاتمے پر اپنا ایک نیا ادبی نام لکھ دیتے تھے۔ اس طرح کے متعدد نام ان کے مضامین کے آخر میں درج ہیں۔ مثلاً 'راقم حق نگار' 'تجزیہ کار' 'راقم چشم دید' 'راقم شفا خواہ' 'حق پسند' 'طلسم شکن' 'راقم حسن ظن' 'راقم صلح کل' 'راقم احسان بے منت' 'راقم قصور' 'راقم موشگاف' 'راقم تن بتقدیر' وغیرہ۔

اودھ اخبار کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ ماہ فروری ۱۸۶۲ء سے ۳ اکتوبر ۱۸۶۲ء تک رعنا کا قیام لکھنؤ میں رہا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اس طویل قیام کی غرض کیا تھی لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں قلمی جہاد بہت زور و شور سے جاری رکھا۔ منشی نولکشور اور غلام محمد خاں منیجر اودھ اخبار رعنا کے بڑے قدر دان تھے اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ رعنا کے بھی مضامین کے آغاز میں منشی نول کشور نے حسب ذیل سطور بطور تعارف لکھی ہیں اور ان کی شعر گوئی، سخن فہمی اور ذہانت و ذکاوت کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ ٹاڈ کی تاریخ راجستھان کا اردو ترجمہ رعنا کی توجہ اور کوشش سے منشی نولکشور نے طبع کرایا تھا۔

رعنا کے حسب ذیل مطبوعہ مضامین میرے پاس موجود ہیں۔

فہرست مضامین رعنا

نمبر شمار	عنوانات	نوعیت	تاریخ و سن اشاعت
۱	زنانِ مردانہ وارِ ہند	اصلاح معاشرت	ماہ مئی ۱۸۶۲ء

۲-	ترمیم در امور تنجیم	علم نجوم	ماہ مئی	سنہ ۱۸۶۲ء
۴-	تکیہ کلام	اخلاقی	〃	〃
۵-	خیالاتِ رعنا	اخلاقی	〃	〃
۶-	دورۂ ارضی	جغرافیائی	〃	〃
۷-	اطبائے ہند	اصلاحی	ماہ جون	سنہ ۱۸۶۲ء
۸-	نقار خانے میں طوطی کی آواز	اصلاحی	〃	〃
۹-	خیال خیر مآلِ رعنا بہ تبعیت مرشد نا غالب	سیاسی	〃	〃
۱۰-	حق اللہ و حق العباد	اخلاقی	〃	〃
۱۱-	خدا مہربان تو کل مہربان	معاشرتی	〃	〃
۱۲-	طلسم شکن طوائفان	اصلاح معاشرت	〃	〃
۱۳-	اسباب زیر کی اہل فرنگ	سیاسی و علمی	ماہ جولائی	سنہ ۱۸۶۲ء
۱۴-	رواج فہرست رسائل و اخبارات مطبوعہ	صحافتی	〃	〃
۱۵-	چون کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی	اصلاحی و اخلاقی	〃	〃
۱۶-	خطاب رعنا	اصلاحی	〃	〃
۱۷-	وجود باری تعالیٰ	مذہبی	ماہ اگست	سنہ ۱۸۶۲ء
۱۸-	صلاح بر فلاح	اخلاقی	〃	〃
۱۹-	تعلیم علم خواب مقناطیسی (مسمریزم)	فنی	〃	〃
۲۰-	لکھنؤ کی عزاداری	تاریخی	〃	〃
۲۱-	چراغ روشن مراد حاصل		〃	〃
۲۲-	ترتیب تاریخ ہر شہر و ضلع	تاریخی	〃	〃
۲۳-	فرقہ محشان کی تاریخ	تاریخ معاشرت	ماہ ستمبر	〃
۲۴-	تہذیب و تعلیم اولاد طوائف	اصلاحی	〃	〃
۲۵-	خیالات رعنا در باب آئین ہر رواج	سیاسی	〃	〃
۲۶-	امام باڑہ حسین آباد و مقبرہ محمد علی شاہ	تاریخی	〃	〃
۲۷-	کمیٹی دافع اضرار حیوانات	اصلاحی	〃	〃
۲۸-	حق اقبال محبوم	توالدی	〃	〃
۲۹-	گلدستۂ رعنا	ادبی	〃	〃
۳۰-	گریم مشکل و گرنگویم مشکل	ادبی و تنقیدی	ماہ اکتوبر	〃
۳۱-	رواج باغ شاہی در ہر ضلع	اصلاحی	〃	〃
۳۲-	الندلو فحش فرقہ ملعونہ طوائف	اصلاح معاشرت	〃	〃
۳۳-	جواب اعتراض اکبری (امرناتھ اکبری)	تنقیدی	〃	〃

۳۴۔	خطاب رعنا از حضرت پادریان	مذہبی و اخلاقی	ماہ ستمبر سنہ ۱۸۸۲ء
۳۵۔	تحقیق حال کافرستان	تاریخی	" " "
۳۶۔	تدبیر آبادی جنگل افتادہ از طائفہ مساکین	معاشی	" " "
۳۷۔	جنگ زرگری و زرگراں	"	" " "
۳۸۔	علم و خلق	"	ماہ اگست "
۳۹۔	من محوب می شناسم پیران پارسارا	تنقیدی و ادبی	ماہ ستمبر "
۴۰۔	فاش می گویم	علم قیافہ	ماہ مارچ "
۴۱۔	اخبار نویسی بڑا مشکل کام ہے	صحافت	" " "
۴۲۔	طوا خوردن را روئے باید	اصلاحی	ماہ اپریل "
۴۳۔	سوال رعنا	ادبی تنقیدی	" " "
۴۴۔	نتمہ مضمون طلسم شکن طوائف	اصلاح معاشرت	" " "
۴۵۔	حسن تدبیر بندوبست استمراری	اقتصادی	" " "
۴۶۔	احوال ملکہ وکٹوریہ	سوانح	ماہ اگست "
۴۷۔	وثیقہ داری	معاشرتی	" " "
۴۸۔	تقرر مجلس عام بطور ہوس آف کامنس	قانونی اصلاحی	" جون "

رعنا کی شاعری

رعنا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں کوئی امتیازی خصوصیت تو نظر نہیں آتی البتہ وہ ایک قادر الکلام شاعر ضرور تھے۔ الفاظ پر بڑی قدرت تھی۔ قصائد کے علاوہ غزلیں بھی خاصی طویل ہوتی تھیں۔ غالباً انھوں نے ہر صنف سخن پر کم و بیش طبع آزمائی کی ہوگی۔ لیکن میرے پیش نظر ان کے متعدد قصائد، غزلیات اور چند قطعات ہیں جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں۔ ایک غزل کا عنوان ہے "عالم اشوب" حافظ کی مشہور غزل ع ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم" پر امرتا تھ اکبری نے ایک غزل لکھی تھی" ع ایں چہ شوریست کہ در دور زحل می بینم" رعنا نے اکبری کی غزل پر غزل کہی۔

ایں چہ شوریست کہ در دور فلک می بینم — شور و شر را ز سما تا بہ سمک می بینم
شور در عالم و شر در بشر خاص و عام — سر بسر فتنہ بہر جن و ملک می بینم
حیف از دہر چرا نام شغاشد کافور — دور علت ز کتک تا بہ تمک می بینم

مرزا غالب کی ایک مشہور غزل کا مصرع ہے: "بحسرت مردن استغنائے قاتل را جوابستی" اس پر رعنا کی ایک طویل غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جہاں آمد بجان، جان جہانے در نقابستی — در عالم محو دیدار است و تو اندر نقابستی
جہاں بحر فنا عمر رواں نقشے بر آب استی — مزن دم بر حیات خویش کہ عین جوابستی
بقول او ستادم شوق وصلش جانستاں باشد — بحسرت مردن استغنائے قاتل را جوابستی

اسی طرح پر ایک اور غزل بھی لکھی تھی جس کا مطلع ہے۔

دل مضطر چرا مشاطہ در زلف رسا بستی — سر سودا بتو دش تا بلا اندر بلا بستی

اردو میں رعنا کی بہت سی غزلیات اور قصائد اودھ اخبار لکھنؤ اور کوہ نور لاہور میں شایع ہوئے مہاراجہ کپورتھلہ کی شان میں ایک طویل قصیدہ کوہ نور مورخہ ۸ راگست ۶۲ء اور اودھ اخبار مورخہ ۱۶ راگست ۶۲ء میں شایع ہوا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

نسیم گل نے کیا باغ دیر کو تسخیر
بہار گلشنِ عالم میں اب ہے عالمگیر

لارڈ کیننگ کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھا تھا:

وہ اقبالِ مجسم تھا کیننگ آہ
کہ تھا عالم میں اس کا جا بجا شور

خلیق و محسن و مونس، مربی
شجاع و عاقل و فیاض و غم خور
دلِ مغمومِ رعنا سے یہ سن کر
صدا آئی بصد "غم ہائے غم خور"

۱۸۶۲ء

رعنا کی متعدد غزلیں پیشِ نظر ہیں لیکن نمونہ ایک مختصر غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اللہ رسائی نہ کرے زلف رسا کی
الجھے دلِ دشمن بھی نہ گیسوئے دوتا سے
بگڑے ہوئے تیور ہیں خدا خیر کرے
بے وجہ مجھے وہ نظر آتے ہیں خفا سے
اللہ رے یہ گرمیٔ اختلاطِ محبت
بگڑا جو وہ بت مجھ سے تو بگڑا میں خدا سے
طالب اسد اللہ کا غالب کا ہوں شاگرد
بیعت مجھے بے واسطہ ہے شیرِ خدا سے

رعنا بڑے ذہین اور طباع تھے۔ وہ ایک وقت میں مختلف اور گوناگوں میدانوں میں اپنی دماغی قوتوں کو صرف کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کسی ایک علم یا فن میں امتیازی خصوصیت نہ حاصل کر سکے۔ ایک طرف ان کو شعر و سخن اور انشا پردازی کا شوق تھا۔ دوسری طرف ملکی اور سیاسی معاملات و مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسی کے ساتھ نجوم، رمل اور موسیقی سے ذوق تھا۔ اگر ان کا ذوق صرف شعر و سخن اور انشا پردازی پر اکتفا کرتا تو یقیناً وہ ایک بلند پایہ شاعر اور اچھے انشا پرداز ہوتے تاہم ان کا سرمایہ نظم و نثر قابلِ قدر ہے۔ اور اردو زبان و ادب کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔

فکر اور خون کا
دل پر گہرا
اثر ہوتا
ہے

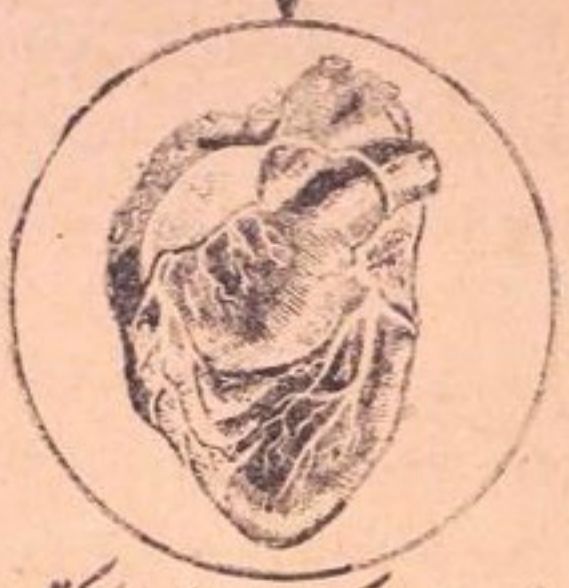

جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظامِ عصبی کے فعل کو درست کرتی ہے،
خون کو صاف کرتی ہے اور شفاف خون پیدا کر کے چہرے پر تازگی لاتی ہے۔

ہمدرد

دہلی — کانپور — پٹنہ

فورٹ ولیم کالج کی ایک ناقابل فراموش شخصیت

ڈاکٹر احراز نقوی

اردو شاعری جب اپنے پورے شباب پر تھی اس وقت کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی اور نثری اسالیب کی طرف توجہ کی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کا نثری سرمایہ خواہ سیاسی یا سامراجی استحکام کی منصوبہ بندی ہو یا لسانی سازش بہر حال اس کی افادیت یا ادبی احتیاج سے تو انکار نہیں ہو سکتا مگر اس زمانے میں لکھنؤ اور دلی والوں کی نظر میں فورٹ ولیم کالج کا نثری سرمایہ ادبی تمیز اور اس کے حدیقے سے باہر تھا۔ ان کے نزدیک فارسی، انشاء اور شاعری ہی ادب تھا اس لئے فورٹ ولیم کالج کے رشحات درخور اعتنا نہ سمجھے گئے۔ مؤلف تذکرۂ گلشن ہند لکھتا ہے۔

"اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا حمالی ہے"۔

پھر بھلا فورٹ ولیم کالج کے دانشوروں کو کون پوچھتا؟ اور کون ان کی تاریخ لکھتا؟ یہاں تک کہ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں بھی ایسی معتبر تصنیف نہیں ملتی جو ان ارباب فن کے کوائف اور شغل و زندگی کا احاطہ کرے۔ یہی بات کہ آج ان قلم کاروں کی تحریریں تو کسی حد تک زمانے کی دستبرد سے مصئون نظر آتی ہیں۔ مگر ان کی شخصیت اور سیرت کے خط و خال قدر ناشناسی کے غبار سے معدوم ہیں اور ادب کا ہر جدید مورخ یہاں آکر گم اور گنگ نظر آتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی وہ قابل قدر ہستیاں جو آج کنج خمول میں ہیں انھیں میں سے ایک بدنصیب، شیخ اکرام کا بھی نام ہے۔ شیخ اکرام کے سلسلے میں ہماری معلومات کا سرمایہ بیحد حقیر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سید محمد فورٹ ولیم کالج کا محقق لکھتا ہے۔

"مولوی اکرام علی بہت ہی گمنام شخص ہیں۔ ان کے حالات معاصرین نے بھی نہیں بیان کئے ہیں۔ مؤلف طبقات الشعرائے ہند نے ان کا ذکر تو کیا ہے مگر حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالی"۔[1]

ابھی کچھ عرصہ ہوا۔ "اکرام علی اور فورٹ ولیم کالج" کے نام سے ایک کتاب نادم سیتاپوری کی طبع ہوئی ہے۔ نادم صاحب کا یہ تحقیقی کارنامہ قاضی الیاس سیتاپوری کا مرہون منت ہے۔ غالباً جہاں تک میرا علم ہے اس کی بنا پر یہ خیال ہے کہ قاضی الیاس کا مقالہ جو شیخ اکرام کے سلسلے میں یکم نومبر ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا۔ وہی موصوف کے سلسلے کا سب سے اہم ماخذ بنا اور اسی مضمون کو نادم سیتاپوری نے اپنی کتاب کی اساس بنایا ہے۔ جس کا خود انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر صرف یہ ایک مضمون شیخ اکرام کے سلسلے میں جہاں ہماری تحقیق اور تجسس کی راہوں کو کھولتا ہے۔ وہاں نہ جانے کتنی اور تحقیقی استفسارات کے راستوں کو پیدا کرتا ہے۔ نادم صاحب کی کتاب واقعی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مگر مواد کی عدم فراہمی کا بھی قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ اور تحقیقی تصامحات سے بھی مبرا اس کتاب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ میرے اس مقالے کا مقصد اس کتاب کی تنقیص یا بحث مقصود نہیں ہے۔ بہت سے مقامات پر میرا اُن کا تحقیقی اختلاف ہے اور نتائج برعکس نظر آتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا مقالہ حرف آخر کا حکم رکھتا ہے مگر جہاں تک اس کی اہمیت کا سوال ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مولوی شیخ اکرام فورٹ ولیم کالج میں کئی اعتبار سے ایک بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی پہلو دار شخصیت ایک عالم، اُستاد، حکیم، مترجم محقق اور اپنے عہد کے ایک اہم انشاء پرداز کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ اور اُن کے پُرکھے بڑے بڑے صوفی بزرگ، اللہ والے، عالم، مورخ اور حکیم گذرے ہیں۔ جن میں بابا فرید گنج شکرؒ، ہمام الدین خاوند شاہ اور شیخ پیکی قادری جیسے جلیل القدر بزرگ قابل ذکر ہیں۔ شیخ اکرام کا وطن سیتاپور (یو۔پی) ہے اور جس محلے کے ساکن تھے اس کا نام شیخ سرائے ہے جو اُن ہی کے

---

[1] ملاحظہ "ارباب نثر اردو" ص ۲۳۲۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ ۱۹۳۷ء۔ [2] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ ادارۂ فروغ اردو۔ ۱۹۵۱ء

بزرگوں کا بسایا ہوا تھا اور آج بھی وہ اسی نام سے شہر سیتاپور میں قائم ہے۔ باپ کا نام شیخ احسان علی تھا۔

"حکیم موصوف سیتاپور کے رئیس اور محلہ شیخ سرائے میں سکونت پذیر تھے۔ مرحوم کے والد ماجد کا نام شیخ احسان علی صاحب تھا حکیم صاحب (شیخ اکرام) کے آباؤ اجداد ارباب تصوف میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن خدا نے دنیاوی مال و جاہ سے سرفراز کیا تھا دربار شاہی میں مناصب جلیلہ پر ممتاز تھے۔ محمد شاہ دہلی اور لکھنؤ کے دربار سے اُن کیلئے جاگیریں اور وظائف معین تھے" (انتظار یکم نومبر ۱۹۱۵ء)

حکیم شیخ احسان علی کی شادی قصبۂ بارڈی (تحصیل مدھولی) ضلع سیتاپور میں رئیس قاضی شیخ غلام رسول صدیقی کی لڑکی سے ہوئی اور حکیم شیخ احسان علی نے اپنے لڑکے شیخ اکرام علی کی شادی سبحان علی خاں کی لڑکی سے کی۔ جو سرکار اودھ کے منصب دار تھے اور شیخ سرائے سیتاپور میں سکونت پذیر تھے اور شہر کے عمایدین میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے شیخ اکرام علی کا ننہال اور ددھیال دونوں علم و فضل کا گہوارہ تھے۔ اسی ماحول میں موصوف کی علمی اور اخلاقی تربیت ہوئی۔ قاضی الیاس مرحوم کی روایت کے بموجب شیخ اکرام علی کی جب عمر نو برس کی تھی تو اُن کے باپ مولوی احسان پر نہ جانے کیا افتاد پڑی کہ تن تنہا گھر بار چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ وجہ اور سبب نہ معلوم ہو سکا۔ بعض لوگوں نے دماغی خلل کا جواز تراشا ہے۔ مگر یہ روایت ثقہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔

بچپن میں باپ سے بچھڑ جانے کا صدمہ موصوف کی زندگی پر بہت گہرا پڑا۔ اور یہ غم کی خلش انھیں زندگی بھر رہی۔ غالباً اسی غم کے رجحان نے انھیں بے حد حساس اور ذمہ دار بنا دیا۔ چنانچہ ان کی ساری توجہ کسب علم کی طرف مائل ہو گئی۔ طبعی اور ذہانت نے بہت جلد علم و فضل کی منزلوں کو طے کرنا شروع کر دیا۔ ابتدائی اکتساب علمی کے بعد کلکتے کے "مدرسۂ عالیہ عربیہ"[1] میں داخل ہو گئے قاضی الیاس اپنے قلمی نسخے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آخر ایک ناصح مشفق کی نصیحت سے متاثر ہو کر ترک وطن کر کے پہلے مولوی حاجی تراب علی صاحب نامی خیرآبادی مدرس مدرسۂ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس کے ذریعہ سے سفر کی ناقابل برداشت صعوبتیں اٹھا کر کلکتے کے مدرسۂ عالیہ عربیہ میں داخل ہوئے"[2]

حاجی تراب علی فرنگی محلی شیخ اکرام کے حقیقی بھائی نہیں بلکہ رشتے کے بھائی تھے اگرچہ تراب علی کی پوری زندگی ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے مگر وسیط النحو کے مطالعے اور نتائج الافکار، تذکرۂ شعرائے دکن اور گلشن پرشاد در مالکی سوانح عمری مولوی محمد کاظم[3] اور ڈاکٹر صفدر[4] کے تحقیقی

---

[1] مدرسۂ عالیہ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل اول نے مسلمانوں کی درخواست پر عربی، فارسی، اردو اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم کے لئے ۱۷۸۱ء میں قائم کیا اس کی نگرانی کے لئے ۱۷۸۸ء میں کپتان اردن کو اس کا سکریٹری مقرر کیا۔ میجر یا سو نے اپنی کتاب "تاریخ تعلیم" صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے کہ ایک سو سے زیادہ طلبا کو تین تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ) وساطت سے یہ بھی تحقیق کر سکتے ہیں کہ مولوی خلیل الدین اشک خیرآبادی (مترجم داستان امیر حمزہ) کے علاوہ مولوی حفیظ الدین احمد نے بھی اسی کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ "تاریخ تعلیم" خالد یار خاں کی تصنیف میں اس کالج کے قیام کی تاریخ ۱۷۸۰ء دی ہوئی ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲۶ سید طفیل احمد منگلوری نے اپنی کتاب (مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں اس کے قیام کی تاریخ ۱۷۸۱ء لکھی ہے۔

[2] قلمی نسخہ صفحہ ۱۹ قاضی الیاس سیتاپور کے بڑے عالم بزرگ تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی تنہا رہ کر اور لکھ پڑھ کر گذاری آخر عمر میں کسی عزیز کی تعزیت میں (بارڈی تحصیل مدھولی) تشریف لیگئے۔ وہاں سانحہ خیریت رخصت ہوئے مگر پھر اس کے بعد آج تک پتہ نہ چل سکا کہ کہاں غائب ہو گئے۔ سیتاپور میں اُن کا آج بھی کتب خانہ نجی اور قلمی نسخوں کا دفتر اور خود ان کی تحریروں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مذہبی، علمی اور ادبی[5] موجود ہیں۔ ان کے بارے میں یہی گمان اغلب ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔

[3] سوانح عمری مولوی محمد کاظم کے مصنف نے بر سبیل تذکرہ ان دونوں تذکروں سے کچھ زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ اور فرنگی محل کے علماء کی فہرست میں موصوف کے علم و فضل کی تصدیق ان کے معاصروں کے ساتھ یوں کی ہے "مولوی عبدالحکیم، مولوی عبدالحلیم، مولوی عبدالحئی، مولوی محمد ابراہیم، مولوی سعداللہ، مولوی تراب علی، واحد علی نقلی اور عقلی کے جامع تھے۔ (سوانح عمری مولوی محمد کاظم صفحہ ۱۳۶)

[4] ڈاکٹر صفدر اپنے تحقیقی مقالے میں تراب علی کے ساتھ کچھ دانشوروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ان سب نے مل کر (یعنی علماء فرنگی محل) صرف نحو معنی اور بیان، ادب اور شعر، عروض عربی، ہیات، فقہ، اصول فقہ، کلام، عقائد، منطق، فلسفہ، طبعیات والہیات وغیرہ میں لکھنؤ کا پایہ بہت بلند کر دیا (شاہان اودھ کے دور میں زندگی اور شاعری صفحہ ۱۵۱ نسخہ غیر مطبوعہ)

مقالے (غیر مطبوعہ) سے واضح ہوتا ہے کہ تراب علی بڑے پائے کے عالم بزرگ گذرے ہیں۔ عربی فارسی میں کمال حاصل تھا۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ناجی تخلص تھا اور ہندوستان کے فارسی شعراء میں اُن کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی سبھی تصانیف کا سراغ نہیں ملتا۔

باپ کے اچانک صدمے نے شیخ اکرام علی کی زندگی کی باگوں کو علم کی طرف موڑ دیا۔ یہی اُن کی زندگی کا انقلابی ردعمل تھا۔ جو انھیں پٹنہ کر کلکتے لے گیا پھر اس کے بعد کلکتے سے دہلی لے آیا۔ شیخ اکرام کلکتے سے دہلی کیوں آئے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جو تمام تحقیق کے بعد بھی واضح نہیں ہوتا مگر گمان یہی ہوتا ہے کہ دہلی میں اکتساب علم کی خاطر وہ آئے ہوں گے۔ تحقیق سے اتنا بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دہلی میں شیخ اکرام کے چچا مردان علی بھی سکونت پذیر تھے۔ جو دربار سے منسلک تھے مگر یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ شیخ اکرام کے دہلی آنے میں ان کے چچا کا تلطف اور رفاقت کہاں تک شامل رہی یہ بھی توجہ طلب نکتہ ہے کہ وہ اس وقت تک حیات بھی تھے یا نہیں۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ قاضی الیاس مرحوم بھی اس کی وضاحت نہ کر سکے اور انھوں نے یہی لکھا ہے

دہلی آئے اور بمقام جامع مسجد یہاں کے نصاب کے موافق یہاں کے علماء کو امتحان دے کر سند حاصل کی ——— (قلمی نسخہ ص۱۹)

دہلی میں تحصیل علم سے فراغت کے بعد یہ عین قرین قیاس تھا کہ وہ یہیں رہ پڑتے مگر وہاں کے ناسازگار حالات نے انھیں دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ دہلی کی تھلیں تو یوں بھی اجڑ رہی تھیں۔ اب رہا لکھنؤ کا معاملہ، لکھنؤ میں جس انداز کی درباری زندگی لہو و لعب کے ساتھ فروغ پا رہی تھی۔ شیخ اکرام کا طبعی میلان اور مذہبی عقائد قطعی منافی تھے۔ مناسب یہی تھا کہ شیخ اکرام اپنے بھائی تراب علی کے پاس پھر چلے جائیں۔ اس زمانے میں تراب علی کا مقام بڑی حیثیت رکھتا تھا اسی تقویت اور برتے پر شیخ اکرام کلکتے واپس چلے آئے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب گل کرسٹ اور لارڈ ولزلی کی کوششوں سے کلکتے میں (گل کرسٹ کا مدرسہ ختم ہو کر) فورٹ ولیم[1] کالج کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا۔ اور پڑھے لکھوں کی چھٹیا کلکتے میں جمع ہو رہی تھی چنانچہ تراب علی کی سفارش اور توسل سے فورٹ ولیم کالج میں شیخ اکرام کو مسٹر براہم لاکٹ کی اردو تعلیم کے لیے مامور کیا گیا۔ یہ موصوف کے معلمی اور تبحر کا نتیجہ تھا کہ براہم لاکٹ جیسا فوجی ذہنیت کا شخص علم و ادب کی طرف مائل ہو گیا اور جان گل کرسٹ کے مستعفی ہونے یعنی ۱۸۱۰ء کے بعد شعبۂ تصنیف و تالیف میں براہم لاکٹ کا شمار ارباب حل و عقد میں رہنے لگا۔ براہم لاکٹ اپنے استاد کے مرتبہ سے بخوبی واقف تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھ شعبۂ تصنیف و تالیف میں شیخ اکرام کو منسلک کر لیا۔ اور کتاب اخوان الصفاء کے ایک حصے کا ترجمہ کروایا۔ قاضی الیاس اپنے تحقیقی قلمی نسخہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اخوان الصفاء کا اس حصے کا ترجمہ اردو میں شروع کیا جس میں انسان اور جانور کا مناظرہ ہے۔ ۱۲۲۵ھ ہجری ۱۸۱۰ء میں یہ ترجمہ ختم ہوا۔" (ص۲۲)

اخوان الصفاء تر پن رسالوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف کا مسئلہ صدیوں سے آج تک تحقیق نہ ہو سکا۔ موضوعات کے لحاظ سے یہ رسالے اخلاقیات مذہبیات، معاشیات علم تصوف اور فلسفے کا بحر بیکراں ہیں۔ جن کی تفصیل اور تجزیہ کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ اس بحث سے قطع نظر شیخ اکرام نے یہ ترجمہ[2] عربی سے کیا ہے۔ کرنل نیلنگ نے اپنے مضمون میں برسیل تذکرہ اخوان الصفاء کے ضمن میں بجائے شیخ اکرام علی کے تراب علی نامی کا نام لکھا ہے

"The Ikhwanus afa in urdu Translated from Arabic by Toorab Ali."

قاضی الیاس ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

۱۸۱۰ء میں یہ ترجمہ ختم ہو کر اول اول ٹائپ میں وہیں چھپا جس کے سرورق پر مترجم اکرام[3] علی حنفی درج تھا۔ (قلمی نسخہ ص۲۰)

شیخ اکرام علی کے اس ترجمہ کے بعد کسی دوسرے مطبوعہ ترجمے یا تصنیف کا سراغ نہیں ملتا تذکرۃ المصنفین کا حوالہ قاضی محمد الیاس کے نسخے میں ان الفاظ کے ساتھ ملتا ہے۔

---

[1] انگریزی ملازمین کے لیے ہندوستانی تعلیم اور ان کی تہذیب و معاشرت کے لازمی علم کا اعلان ۱۷۹۸ء میں کیا گیا مگر اس کی تکمیل ۱۸۰۰ء میں کی گئی جس کے پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ براون ——— (Rev. David Brown) (ملاحظہ ہو گل کرسٹ اور اس کا عہد ——— محمد عتیق صدیقی) ص۳۲ ہوئے۔

[2] اخوان الصفاء کا ترجمہ قریب قریب ہر زبان میں ہو چکا ہے مگر شیخ اکرام کے پیش نظر نسخہ عربی کا تھا فارسی کا نہیں۔

[3] اخوان الصفاء کے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس بھی دو نسخے ہیں پہلا ——— ۱۹۱۶ء کا جو شیخ اکرام کے پوتے منشی حسن رضا ادیب نے امیر المطابع سے شائع کیا اور دوسرا ——— ۱۹۳۵ء کا جو انجمن ترقی اردو دہلی کا ہے۔

"یہ مذکرۃ المصنفین بھی آپ ہی کی تالیف تھی جو نہایت تحقیق سے لکھی گئی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی یہ کتاب عرصے تک آپ کے (شیخ اکرام) خاندان میں رہی اس کے بعد خاندانی نوگوں کی غفلت و بے پروائی سے یہ کتاب کسی طریقے سے سیتاپور کے سب جج عبدالسلام رامپوری کے یہاں پہونچ گئی اور یہ کتاب ہمیشہ کے لیے اس خاندان سے رخصت ہوگئی۔" (قلمی نسخہ ص۲)

پھر ایک اہم بات اپنے قلمی نسخے میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ کے بعد داماد سید وزیر علی اجمیر شریف جاکر آپ کے متعلقین کو سیتاپور لے آئے۔ آپ کا کل اسباب بیش لڑھیوں (گاڑیوں) پر لاد کر اجمیر شریف سے سیتاپور لایا گیا۔ جن میں نایاب کتابیں بھی تھیں اکثر نادر اور نایاب کتابیں ضائع ہوئیں۔" (قلمی نسخہ ص۲۵)

ابھی کچھ عرصے کی بات ہے کہ راقم الحروف کو ایک نسخہ قلمی سیتاپور کے قیام میں ان کے قدیمی مکان میں بوسیدہ اور کرم خوردہ کتابوں میں "اسرار قاسمی" کا دست یاب ہوا۔ کتاب کے آخر میں نام "شیخ اکرام علی" درج ہے یہ نسخہ شیخ اکرام کا تصنیف کردہ نہیں ہے۔ اس کتاب کا مصنف ملا واعظ کاشفی ہے اور علم نجوم سے متعلق ہے۔ مگر کتاب میں ملا واعظ کاشفی کا نام القطع ہے۔ بہر حال موصوف کا نام درج ہونے سے ان کی ملک کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی گمان ہو سکتا ہے کہ شیخ اکرام نے اس کتاب کو خود نقل کیا ہو اور ان دونوں باتوں سے قطع نظر اظہر یہ ضرور ہے کہ شیخ اکرام کو علم نجوم سے اسی طرح سے شغف تھا جس طرح حکیم مومن خاں مومن کو تھا اور حکمت سے بھی شیخ اکرام کو بہت گہرا ذوق تھا۔ اپنی عمر کے آخر حصے میں موصوف نے حکمت کو خلق خدا کی خدمت کا ذریعہ بنایا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ گل کرسٹ کے عہد میں کوئی ایسا رکارڈ نہیں ملتا جس کے بل بوتے پر یہ ہم کہہ سکیں کہ شیخ اکرام نے بھی کسی نوعیت کا کوئی معلمانہ یا مولفانہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ بات محض قیاس کے توسط سے ہی کہی جا سکتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے آخری زمانے میں کالج کے حلقۂ ارباب میں شامل ہوئے۔ اور "اخوان الصفا" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۸ء میں فورٹ ولیم کالج نے ہندوستانی پریس سے طبع کروایا۔ اور یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کہ ہندوستانی پریس شیخ اکرام کا قائم کردہ ہے۔ دراصل اس تحقیق کا ماخذ اختر شہنشاہی ہے۔[۵۱] تحقیق کے اس ثانوی ماخذ کو مختلف محققوں نے برحق مانا ہے۔ قاضی عبدالغفار فرماتے ہیں۔

"جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اردو کا پہلا مطبع ۱۸۱۰ء میں بمقام کلکتہ قائم ہوا۔ پریس کا نام "ہندوستانی پریس" تھا اور اس کے مالک کوئی اکرام علی صاحب تھے۔"[۵۲]

اسی طرح قاضی الیاس سیتاپوری اور نادم سیتاپوری کا بھی اصرار خصوصیت کے ساتھ ہے۔ مگر عتیق صدیقی اپنے ایک تحقیقی موقف کی بنا پر اس تحقیق کو رد کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔

"فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ تجارتی چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قائم ہوا اس کا نام۔ ہندوستانی پریس تھا۔"[۵۳]

اس کے بعد اپنی کردہ دوسری کتاب ۔۔۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں اپنے قول کی پوری توثیق اس طرح کرتے ہیں۔

"گل کرسٹ نے اپنے خط مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۰۱ء میں ہندوستانی شعبے کے لیے خود کتابیں چھاپنے کی تجویز کالج کونسل کے سامنے پیش کی تھی اس کے متعلق کونسل کے کسی قطعی فیصلہ کا ہم کو پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گل کرسٹ نے عملاً طباعت کا کام اعلیٰ پیمانے پر شروع کر دیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے سب سے پہلے ایک چھاپے خانے کا انتظام کرنا ضروری سمجھا۔"[۵۴]

ہندوستانی پریس کی تاریخ اول الذکر کتاب میں ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں لکھی ہے۔ اور موخر الذکر کتاب نے بغیر حوالے اور بغیر ثبوت کے تاریخ قیام ۱۸۰۲ء لکھی ہے۔ اس سے قطع نظر عتیق صاحب کی تحقیق سے بہر حال اتنا تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی پریس کی بنیاد شیخ اکرام سے نہیں بلکہ گل کرسٹ کے ہاتھوں پڑی۔ دوسرے تقدم کا شرف بھی گل کرسٹ کو ملتا ہے۔ مگر اشرف نقوی کی تحقیق کی اس سے تردید نہیں ہوتی اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ اکرام علی کی ملکیت ہندوستانی پریس رہی تھا اس سلسلے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اشرف نقوی کو اپنے زمانے میں جو ماخذ میسر تھے اسی کی بنا پر موصوف کا یہ تحقیقی استنباط

۵۱۔ "اختر شہنشاہی" پر راقم الحروف کا مضمون ملاحظہ ہو ماہنامہ سب رس جولائی ۶۰ء

۵۲۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ نگار۔ لکھنؤ ۱۹۳۰ء ۔ ۵۳۔ ہندوستانی اخبار نویسی ص۴۲ ۔۔۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۵۶ء

۵۴۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ۔۔۔۔۔۔ ص۱۵۱ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۰ء

شیخ اکرام، اشرف نقوی کے ہم وطن ہونے کے علاوہ دونوں ایک ہی معزز برادری تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ دونوں کے زمانوں میں خاصا بُعد تھا۔ اس لیے اشرف نقوی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انھوں نے یہ بات ہوا میں کہہ دی ہو۔ بہر حال ان کے پاس اس وقت یقیناً کوئی معتبر ذریعہ تھا۔ مگر یہ واضح رہے کہ اشرف نقوی نے یہ کہیں پر نہ لکھا ہے کہ ـــــ یہ ہندوستانی پریس اردو کا سب سے پہلا مطبع تھا۔ یہ بات دیگر ہے کہ دوسرے محققین ماخذ کی عدم موجودگی کی بنا پر اس کو اردو کا پہلا پریس مان لیں۔ عتیق صدیقی کی تحقیق سے یہ ثابت ضرور ہو گیا کہ پہلا پریس گل کرسٹ نے قائم کیا ہے مگر ہندوستانی پریس پر ملکیت کا دعویٰ غلط نہیں ہو سکتا بلکہ اس سلسلے میں یہ ضرور ذہن میں رکھنا ہو گا کہ گل کرسٹ کا مطبع سے تعلق دو سال سے زیادہ نہیں رہا یعنی ۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۳ء تک اور ۱۸۰۴ء میں جب وہ استعفیٰ دے کر واپس وطن جاتا ہے تو اپنی چھوڑی ہوئی چیزوں کی فہرست میں چھاپے اور ٹائپ کا اندراج کرتا ہے۔ اور آخر میں یہ تحریر کے الفاظ ہیں۔

"فی الحال ڈاکٹر ہنٹر، مسٹر میک ڈاگل ـــــ (Mac dou gal) اور مے کن ٹوش فل ٹن (میڈ کینی (Mac Kin Tosh futen) کی مشترکہ نگرانی میں چھوڑ رہا ہوں[۵۱]"

اور اسی طرح سے ہندوستانی پریس کا کام شیخ اکرام کے ہاتھوں آیا۔ یہ عمل کس طرح سے ہوا۔ اس کے عواقب یا عوامل کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی معتبر ماخذ نہیں ہیں مگر اختر شاہنشاہی کے حوالے کے بعد یہ نہیں انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس پریس کے مالک نہیں ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے چاہے ہندوستانی پریس کی تاریخ اجراء میں تسامح ہو جائے۔

دوسری اس سلسلے کی تحقیق گڑی اردو اخبار کی ہے جس کے بارے میں سید حامد حسن قادری نے داستان اردو تاریخ" میں لکھا ہے۔

مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد کے والد) نے دہلی سے اردو اخبار جاری کیا۔ اردو کا یہ دوسرا اخبار تھا ـــــ پہلا اردو اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا[۵۲]۔

اس تحقیق کی تائید میں عبدالرزاق راشد[۵۳] اور بالخصوص نادم سیتاپوری کا یہ اصرار ہے کہ اردو کا پہلا اخبار کلکتے سے شیخ اکرام نے نکالا۔ مگر اس تحقیق کی پائیداری میں ثبوت بہت ضعیف ملتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں گارساں دتاسی اور اشرف نقوی بھی خاموش ہیں اس کی تردید اور ثبوت میں عتیق صدیقی کے دلائل اور ثبوت زیادہ معتبر معلوم ہوتے ہیں اور اس روشنی میں اگر اردو کا پہلا اخبار ہو سکتا ہے تو وہ "اردو اخبار" (اس اخبار کی کوئی حقیقت نہیں) نہیں بلکہ "جام جہاں نما"[۵۴] ہے جو مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے طلوع ہوا۔

شیخ اکرام کب تک فورٹ ولیم کالج سے منسلک رہے اور کتنے عرصے تک ہندوستانی پریس سے متعلق رہے اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اتنا ضرور تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ براہم لاکٹ کی سفارش سے موصوف کا عمل دخل کالج میں رہا۔ اور تبحر علی کی بدولت شیخ اکرام کلکتے کے صدر الصدور بھی مقرر ہوئے۔ رسالہ الناظر میں قاضی الیاس لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو الناظر یکم نومبر ۱۹۱۵ء

"یہ عہدہ اس زمانے میں جج کے برابر ہوتا ہے"

مگر موصوف کی طبیعت اس پیشے سے بھی بھر گئی اور دنیاوی دھندوں اور جھمیلوں سے گھبرا کر اپنے اجداد کے روحانی اور مذہبی انداز درویش پر چل پڑے اسی نفسیاتی میلان کے باعث ۱۸۳۵ء میں موصوف نے اپنے وطن (سیتاپور) میں ایک مسجد تعمیر کروائی جو آج تک ان کے نام اور کتبے سے مشہور ہے اور انھیں کی ایما سے امیر میں دار الافتاء قائم ہوا۔

۵۱۔ ملاحظہ ہو۔ Proceedings of The college of fort wiliam بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ـــــ عتیق صدیقی ـــــ ص ۱۵۲ op. cit. 155

۵۲۔ داستان تاریخ اردو ص ۵۶ ـــــ حامد حسن قادری۔ ۵۳۔ ماہنامہ نگار ـــــ اگست ۱۹۳۶ء

۵۴۔ مگر اس تحقیق کو ہم عتیق صدیقی سے نہیں منسوب کر سکتے کیونکہ یہ بات تحقیق کی دنیا میں بڑی جانی پہچانی ہے۔ اس سے پہلے مولانا سالک، وقار انبالوی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جس طرح سے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل اور گل کرسٹ" کا تحقیقی مسلہ جمیل نقوی کے مقالے (مشرب۔ جون ـــ جولائی ۱۹۵۶ء) کو سامنے رکھ کر عتیق صدیقی سے نہیں منسوب کر سکتے اسی طرح یہ تحقیق بھی ان کی نہ سمجھی جائے گی۔

"چنانچہ آپ کا انتخاب بحیثیت مفتی اجمیر شریف کے لیے تین سو روپے ماہوار پر ہوا۔ اور آپ نے اس نازک اور اہم کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔"[1]

اجمیر شریف شہر کلکتے سے زیادہ راس آیا۔ یہاں مادّی اور روحانی فیوض دونوں نعمتیں میسر تھیں۔ اور سکون قلب کیلئے یہ جگہ زیادہ مناسب ثابت ہوئی۔ اس سلسلے میں زیادہ مواد نہیں فراہم ہو سکا۔ قاضی موصوف اپنے قلمی نسخے میں تحریر فرماتے ہیں۔

آپ کو اس نرائی عہدے اور جلیل القدر منصب کے کاموں کو مستعدی اور دیانت اور امانت سے انجام دینے کے بعد جو فرصت کا وقت آپ کو ملتا وہ طبابت میں صرف فرماتے تھے۔ اس پیشے میں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ آپ کے دست شفا کی دھوم مچ گئی۔ آپ اپنے گھر کے مصارف کے لیے ہر ماہ ایک ہزار روپیہ بھیجا کرتے تھے۔ اس سے قیاس کر لینا چاہیئے کہ وہاں آپ کی کیا آمدنی ہوتی ہوگی۔"[2]

اجمیر میں شیخ اکرام کی حکمت و علم کی دھوم مچ گئی۔ حسن اتفاق سے ان کے والد (مولوی شیخ احسان علی) نجو ایک عرصے سے مفقود الخبر تھے اپنے لائق بیٹے کا سراغ لگا لیا۔ اس زمانے میں احسان علی حیدر آباد میں تھے۔ آخر رہا نہ گیا اور خون پدری کو جوش آ ہی گیا اور اشتیاق ملاقات کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ اُدھر شیخ اکرام باپ کا خط پاتے ہی مودت پدری سے ماہئ بے آب ہو گئے۔ مگر فطرت کو منظور کچھ اور تھا۔ غیب سے ملنے کے اسباب مہیا ہو گئے۔ مگر جب مولوی احسان علی نے لے پالک بیٹے کو علم ہوتو ڈرے کہ کہیں یہ مال دنیا ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ چنانچہ اس حرص و ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس لڑکے نے شیخ احسان علی کو زہر دے دیا اور اسی زہر نے قصہ تمام کر دیا۔ اس حادثہ کی خبر سے شیخ اکرام کو بڑا شدید صدمہ ہوا اور کچھ ہی عرصے کے بعد ۱۲۵۳ھ ہجری میں اجمیر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ موصوف کا مقبرہ اجمیر ہی میں تعمیر کیا گیا۔

گیارہ سال سے علم و ادب کی گرانقدر اور خاموش خدمات انجام دینے والا اردو کا نیک نام جریدہ

صبح نو

● جو مرکز علم و ادب عظیم آباد سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

● صبح نو کو ہند و پاک کے مشہور و مقبول شاعروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔

● گرانقدر علمی، ادبی اور تنقیدی مقالات، پاکیزہ اور اصلاحی افسانے، حیات افروز نظمیں اور روح پرور غزلیں ہر ایک شمارہ میں ملاحظہ کیجیے۔ زر سالانہ صرف چھ روپے

صبح نو پوسٹ بکس نمبر ۴۲ پٹنہ ۴

۱- ملاحظہ ہو الناظر یکم نومبر ۱۹۱۵ء

۲- قلمی نسخہ

احمد فراز

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زخم کاری لگے

اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گذارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

کسی کی پرسشِ احوال بھی قیامت تھی
وہ دردِ دل میں اٹھا جسطرح کٹاری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

علاج اس دلِ درد آشنا کا کیا کیجے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگساری لگے

فرازؔ تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

ریورنڈ ہنین ریحانی

درد سے مانوس جب اپنی خودی ہو جائیگی
عالمِ امکاں کی رونق زندگی ہو جائے گی

کچھ بھی اس اندھیر نگری میں نہ آئے گا نظر
کیا خبر تھی تیز اتنی روشنی ہو جائے گی

یوں ہی میری تشنگی ساقی اگر بڑھتی رہی
بے پیے ہی ایک دن آسودگی ہو جائے گی

جو بھی چاہے بن مگر مفلس نہ بن اس دہر میں
جنس ہستی ورنہ داغِ نیستی ہو جائے گی

ہم کو اس ظلمت کے عالم میں بھی ہے اتنا یقیں
آپ گذریں گے جدھر سے روشنی ہو جائے گی

یہ گماں کس نے کیا تھا آدمی کو ایک دن
آدمی سے اسقدر بے گانگی ہو جائے گی

گر نہیں شیریں کلامی، تلخ گفتاری سہی
یہ زباں اک روز وقفِ خامشی ہو جائے گی

وہ بھی دن آئے گا ریحانیؔ کہ رندوں کے لیے
اس چمن میں جام کھل کے ہر کلی ہو جائے گی

سعادت نظیر

ستم تو دیکھ! کرم کی کوئی کمی نہ رہی
جب آرزو مرے دل میں سکون کی نہ رہی

ترے فراق نے وہ دردِ جاوداں بخشا
کہ زندگی میں مری اب کوئی کمی نہ رہی

جنونِ شوق نے دونوں کو کر دیا آزاد
کہاں کے دیر و حرم؟ قیدِ بندگی نہ رہی

بھری بہار میں ہے بجلیوں کی زد پہ چمن
کسی بھی پھول کے چہرے پہ تازگی نہ رہی

یہ اضطراب کی دنیا ہے درد و غم کی فضا
اب، اے شکستِ یاراں! وہ زندگی نہ رہی

ملیں جو ان سے نگاہیں تو یہ ہوا محسوس
کہ اب جہاں میں کسی چیز کی کمی نہ رہی

بہار آتے ہی اٹھا دھواں نشیمن سے
یہ کیا کہ شمعِ جلی اور روشنی نہ رہی

فضا نکھر کے ہوئی جاذبِ نظر لیکن
وہ کیا گئے کہ کسی شے میں دل کشی نہ رہی

نہ کیوں ہو مجھ کو غمِ عشق ہی متاعِ عزیز؟
نہیں خوشی کا بھروسہ، رہی، رہی، نہ رہی

دیارِ غیر میں سب کچھ سہی، نظیرؔ! مگر
وہ کوئے دوست کی پُر کیف زندگی نہ رہی

مطبوعات موصولہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

طنز و تبسم

رضا نقوی واہی

مکتبہ ادب روڈ نمبر ۱۶/۵ گروبی باغ پٹنہ (بہار)

صفحات ۱۵۲ قیمت ۳ روپے

"طنز و تبسم" واہی کی طنزیہ اور مزاحیہ نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ۱۹۵۰ء میں "واہیات" کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ ان کے تخلص کے اعتبار سے یہ نام بہت ہی اچھا تھا اور اس مجموعہ کا بھی یہی نام ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پہلے مجموعے کو لوگ بھول چکے ہیں۔ "طنز و تبسم" اتنا سجتا ہوا نام نہیں ہے نہ اس نام میں وہ کشش اور طنز ہے۔

اردو کے مزاحیہ شعرا کی موجودہ نسل میں واہی کا نام جانا پہچانا ہوا ہے۔ ان کے یہاں سید محمد جعفری کا تیکھا پن اور شاد عارفی کی نشتریت نہ سہی مگر فرقت اور دلاور فگار کی طرح عمومیت بھی نہیں ہے۔ ان کو قبول عام تو مل سکتا ہے مگر وہ مقام نہیں مل سکتا جو فکر و مسائل کے توازن اور فن کے ساتھ خلوص اور ریاضت کے ذریعے واہی نے حاصل کر لیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں ہند و پاک کے رسائل و اخبارات میں واہی کی شائع ہونے والی نظموں میں سے ۵۰ منتخب نظمیں شامل ہیں۔ جن میں "ایٹیکل کول گویا شاعر، نقاد، محقق، نیڈی گرل، انتقال کے بعد، پی ایچ ڈی، لیڈری کا نسخہ، انٹرویو، لال فیتہ، اشٹ گرہ اور اے میری زیر پائی" اس کتاب کی آبرو ہیں۔ "جنرل اسپتال، مچھروں کا گیت، (مچھروں کا سوراج) بلیک مارکیٹ، بلیک مارکیٹیر، کنٹرول، لال فیتہ، لیڈری کا نسخہ، اور جاگیر داری" ان کے اولیں مجموعہ "واہیات" سے "طنز و تبسم" میں شامل کی گئی ہیں۔

مسائل اور رجحانات پر واہی کی نظر خاصی گہری ہے۔ مگر موضوعات کی تکرار ان کے یہاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔

طنز و تبسم کی لکھائی چھپائی اچھی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ واہی اس مجموعہ پر قابل مبارک باد ہیں۔

تذکرۂ جگر

محمود علی خاں مرحوم جو اپنے سو شعروں والے سلسلۂ انتخاب کے لیے مشہور ہیں۔ جگر مرادآبادی کے مخصوص میں تھے۔ اور ان سے بہت خلوص و یگانگت کے تعلقات رکھتے تھے۔ زیر نظر مجموعہ میں محمود علی خاں نے جگر کی زندگی اور شعر گوئی پر خود اپنے مشاہدات ترتیب دیے ہیں۔ مرتب نے جن حقوق کی بنیادوں پر یہ کام انجام دیا ہے وہ اس کتاب کی اہمیت کے ضامن ہیں۔

کتاب کا انداز بیان دلچسپ ہے۔ جگر پر کام کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر اور عقیدت مندوں کے لیے عمومی طور پر یہ کتاب باعث کشش ثابت ہوگی۔

کتابت طباعت اور کاغذ تینوں عمدہ ہیں۔ اور کتاب مجلد ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

فردوسِ گوش

فاتح کے نام لیواؤں میں جوش ملسیانی کا نام ہر لحاظ سے قابل ذکر ہے اور ان کا شمار اساتذہ میں کیا جاتا ہے۔ وہ جدید و قدیم دونوں سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ اس لیے اردو شاعری میں انھیں ایک مناسب مقام حاصل ہے۔ جوش اردو کے پرخلوص پرستار ہیں۔ اور پنجاب میں ان کے دم سے اس زبان کا بول بالا ہے۔

جوش ملسیانی کی شاعری کا انتخاب مرکز تصنیف و تالیف لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت چھ روپے ہے۔ اور ناشر ہی کے پتے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہر اردو دوست کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

مقابلہ نہ کیجئے

ہمارا مقابلہ پڑوسیوں سے کیا جائے، ہم میں سے بیشتر اس بات کو پسند نہیں کرتے یہی بات میٹرک باٹوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

میٹرک باٹوں کی خوبیوں کو پہچانیئے سان کا استعمال ان کی موجودہ شکلوں ہی میں کیجئے جیسے ۱۰۰ گرام، ۲۰۰ گرام، ۵۰۰ گرام اور ۱ کیلوگرام وغیرہ۔ جبھی آپ میٹرک نظام کا پورا پورا فائدہ اٹھا پائیں گے۔

میٹرک اوزان کا جوڑ توڑ کر کے من سیر کا حساب نہ لگائیے۔

اس میں آپ کا وقت ضائع ہوگا اور لین دین میں اکثر نقصان رہے گا۔

سہولت اور واجبی لین دین کے لئے

مکمل اکائیوں میں

میٹرک باٹوں

کا استعمال کیجئے ....